برقِ تبسّم

شوکت تھانوی

ناشر

نسیم بک ڈپو لکھنؤ

قیمت مجلد تین روپیہ

[illegible]۔ عزیز الرحمٰن   پرنٹر۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

فہرست مضامین

افیونی کی جنت

میر صاحب نے اپنے دونوں گھٹنوں کے اندر سے سر نکالتے ہوئے کہا "بھائی سچ تو یہ ہے کہ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔ چند روزہ زندگی خدا اسی طرح کاٹ دے پھر مرنے کے بعد تو خدا جانے ہم افیونیوں کا کیا حشر ہو گا۔"

مرزا صاحب نے جو اپنی پیالی کے اندر گویا خود ہی حل ہو جانے کے قریب تھے خفیف سا ابھرتے ہوئے کہا "مرنے کے بعد حشر کیا ہو گا۔ اماں جنت میں جائیں گے اور کیا ہو گا۔ جنت میں ہم افیونی نہ جائیں گے تو اور کون جائے گا۔ ہم نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں۔ نہ ہم کو چوری سے مطلب نہ کسی اور برے کام سے بس ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں ہم کو تو سچ پوچھئے گناہ کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی اور یہی سب سے بڑا ثواب ہے کہ انسان گناہ نہ کرے پھر بھلا جنت ہمارے لئے نہیں تو کیا ان لوگوں کے لئے ہے جو بینک کو تو برا کہتے ہیں مگر اپنی دنیا بھر کی روسیاہیوں کو نہیں دیکھتے۔"

خاں صاحب نے طلسم ہوشربا کی جلد کے اندر سے نکلتے ہوئے فرمایا "سچ کہتے ہو بھائی مرزا ہم لوگ تو واقعی جنتی ہیں سولہ آنہ جنتی اور جو ہم کو جنتی نہ سمجھے

اس پر اسی کالی گولی کی مار پڑے "۔

مرزا صاحب نے اپنی نیم وا آنکھوں سے خاں صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اماں آج اس افیون اور ہم افیونیوں پر ہنسنے والے ہنس لیں ہم کو برا کہنے والے خوب جی کھول کر برا کہہ لیں مگر جب ہم کو جنت میں دیکھیں گے تو ——"

میر صاحب نے بات کاٹتے ہوئے ہمہ تن نون غنّہ بنکر کہا۔ "جی ہاں پھر پچھتائیں گے کہ زندگی میں اس افیون کی قدر نہ کی جو دنیا بھر کے گناہوں سے بچاتی ہے "۔

خاں صاحب نے چونکتے ہوئے کہا۔ "بھائی بات تو جب ہے کہ ہم افیونیوں کو جنت میں بھی یہی صحبت ملے اور یہی محفلیں گرم رہیں۔ اللہ ہی جانے کہ وہاں افیون بھی ہم کو ملے گی یا نہیں "۔

میر صاحب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ بھی آپ نے ایک ہی کہی کہ وہاں بھی افیون ملے گی یا نہیں بھائی یہ تو سمجھو کہ آخر وہاں سوائے افیون کے اور ہوگا کیا۔ میں تم کو اپنا ہی ایک قصّہ سناتا ہوں کہ میں نے کیونکر ذرا سے دھوکے میں جنت کی سیر کی اور کل حالات معلوم کر لئے ہوا یہ کہ اب سے دو دن میرا انتقال ہوگیا۔

خاں صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ "ایں کیا کہا انتقال ہو گیا۔ کیا تمہارا انتقال ہو چکا ہے "؟

میر صاحب نے کہا۔ "ہاں ہاں بھائی انتقال ہو گیا تھا سنو تو سہی۔ بات یہ ہوئی کہ اول تو وقت کچھ ایسا آ پڑا تھا کہ دو دن تک پینے کو نہ ملی۔ ایک غیرت دار افیونی کے لئے یہی موت ہے۔ دوسرے ایک عجیب دھوکا یہ ہوا۔ کہ میرے جا

محلہ میں میرا ایک ہمنام قلعی گر رہتا تھا اس کو ہوا میر سام مگر نام کے دھوکے سے
روح میری قبض کرلی گئی اور فرشتے مجھکو لے کر سیدھے جنت میں پہونچے۔ بس
کچھ نہ پوچھئے کہ میں نے وہاں کیا دیکھا۔ سب سے پہلے تو جنت کے دروازہ ہی پہ
میرا پرانا دوست منجھو جس کا تین برس ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ ملا اور مجھکو دیکھکر
تعجب سے پوچھا ارے بھائی میر صاحب تم کہاں میں نے اس کو اپنے انتقال پرملال
کی خبر وحشت اثر سنائی اس کو بھی سخت صدمہ ہوا۔ اور مجھکو صبر کی تلقین کرنے لگا
کہ مشیت ایزدی یہی تھی اب رونے سے کیا ہوتا ہے خدا تم کو نعم البدل دے گا
وغیرہ مگر پھر وہ پینک سے خود ہی چونکا اور اس نے کہا کہ اماں میر صاحب بھلا
یہ افسوس کرتے یا رونے کا کیا مقام ہے اچھا ہوا کہ تم مر گئے خدا ہر افیونی کو
مرنا نصیب کرے اور سب مر کر یہاں آجائیں اب تو اس کی بددعا پر مجھکو بھی
تعجب ہوا کہ یہ آخر کہہ کیا رہا ہے مگر اس نے میرے تعجب پر مسکرا کر کہا۔ میر صاحب
کچھ خبر بھی ہے۔ کہ تم جنت میں ہو اس جنت میں جس کو دیکھکر تمہاری آنکھیں کھل
جائیں گی چلو تم کو ذرا جنت کی سیر کراؤں۔ اس کے اس کہنے پر میں داروغہ جنت
کے دفتر تک نہ گیا بلکہ سیدھا اس کے ساتھ ہو گیا اور اس کے پیچھے پیچھے جنت
میں داخل ہو گیا بس تم سے کیا بتاؤں کہ میں نے وہاں کیا دیکھا۔ اماں دیکھتا کیا ہوں
کہ نہایت کشادہ سڑکوں پہ دو رویہ افیون کے نہایت عالیشان محلات کھڑے
ہوئے ہیں۔ اور سڑکوں کے دونوں طرف پوستے کے درخت قطار در قطار لگے
ہوئے ہیں۔ جن سڑکوں پر ہم لوگ چل رہے تھے وہ سنگ مرمر کی معلوم ہوتی تھیں
مگر سفید رنگ کی باریک ریت اور سفید چمکدار ڈھیلے بھی جا بجا پڑے ہوئے تھے

میرے دوست منجھو مرحوم ۔ نے کہا کہ اس سڑک کو بھی سمجھئے کہ کس چیز کی ہے میں نے ابھی کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ اس نے مٹھی بھر دھول اٹھا کر میرے منھ میں ڈال دی بس سمجھ لو کہ منھ سے لے کر معدہ تک شیرینی کی لہر دوڑ گئی ۔ اماں ایسی میٹھی شکر تو میں ... نے کبھی کھائی ہی نہیں تھی ۔ میں نے تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول دیا تو منجھو مرحوم نے ایک ڈھیلا میرے منھ میں دے دیا یہ دراصل مصری کا ڈلا تھا ۔ بھائی ایسی مصری اس دنیا میں سو روپیہ تولہ بھی ڈھونڈھو تو نہ ملے عطر میں بسی ہوئی برف سے زیادہ ٹھنڈی روئی سے زیادہ ہلکی اور ایسی مفرح کہ میں کیا کہوں ۔ بہر حال میں مزے لے لے کر مصری کھا ہی رہا تھا کہ منجھو مرحوم نے مسکرا کر پوچھا ۔ کہو کچھ شغل ہو گا میں تو چار دن کا ترسا ہوا تھا ہی نہایت اشتیاق کے ساتھ کہا کہ "نیکی اور پوچھ پوچھ" منجھو مرحوم نے وہیں پر ٹھہر کر کہا "دیکھو تکلف کس بات کا ہے آخر یہ سب کس کے لئے ہے جس عمارت سے چاہو اور جتنی چاہو افیون نوچ لو اور اگر گھلی گھلائی چاہتے ہو تو وہ دیکھو سامنے حوض ہے جس میں تم غوطہ تک لگا سکتے ہو" افیون کی یہ کثرت دیکھکر مجھکو ایک قسم کا اطمینان سا ہو گیا اور میں نے اسی کو مناسب سمجھا کہ پہلے ذرا یہاں کی سیر ہو جائے اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر شغل ہو گا چنانچہ منجھو مرحوم کے ہمراہ چلتے چلتے میں ایک باغ میں پہونچا جہاں گنڈیریوں کے نہایت شاداب درخت قطاروں میں لگے ہوئے تھے یہ گنے کے درخت نہ تھے بلکہ چھلی ہوئی اور کٹی ہوئی گنڈیریوں کے درخت تھے بس یہ سمجھ لو کہ ان کو دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا منجھو مرحوم نے فوراً ایک گنڈیری توڑ کر جو مجھکو کھلائی تو آنکھیں کھل گئیں اے سبحان اللہ کیا تعریف کی جائے اس گنڈیری کی ۔ معلوم یہ ہوا کہ برفی کی تو ذات میں انگور کا رس

کسی نے معطر اور ٹھنڈا کر کے بھر دیا ہے یا پورا خطہ کشمیر۔ دنیا بھر کی شیرینیوں میں لپٹ کر اور تمام دنیا کی خوشبوؤں میں بسنے کے بعد سمٹ کر گنڈیری بن گیا ہے میں ابھی اس گنڈیری کا لطف ہی لے رہا تھا کہ منجھو مرحوم نے مجھ سے کہا "میر صاحب وہ دیکھو سامنے چائے کی نہر بہتی ہے" میں نے حیرت سے کہا "چائے کی نہر!" تو منجھو نے مجھکو نہر کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "جی ہاں یہ چائے کی نہر ہے۔ اس میں نہایت اعلیٰ درجہ کی کشمیری چائے ہر وقت موج در موج بہتی ہے اس نہر پر بہت پیارے نہایت خوبصورت پل بھی بنائے گئے ہیں۔ ایک پل حلوہ سوہن کا ہے جو اس قدر خوش ذائقہ حلوہ سوہن کا بنا ہوا ہے کہ دہلی کا حلوہ سوہن آپ بھول جائیں دوسرا پل دامدانے کی پیا کا ہے جس کو نہایت نزاکت سے بنایا گیا ہے۔ تیسرا پل تالا قند کا ہے ذرا اس پل کا ایک ٹکڑا اٹھا کر دیکھو کہ کس قدر مزیدار ہے۔ یہ چوتھا پل پنچمیل مٹھائی کا ہے ان پلوں پر جا کر تم اس نہر کی سیر کر سکتے ہو۔ میں آئینہ حیرت بنا ہوا منجھو مرحوم کے پیچھے پیچھے نہر تک پہونچ گیا۔ اور حلوہ سوہن کے پل کے اوپر جا کر نہر کی سیر کرنے لگا۔ اس نہر میں واقعی نہایت لاجواب قسم کی کشمیری چائے کا دھارا بہہ رہا تھا جس میں برابر کی بالائی پڑی ہوئی تھی اور خوشبو سے باپ دادا تک کی روحوں کے دماغ معطر ہوئے جاتے تھے پھر اس نہر کا منظر عجیب و غریب تھا۔ کہیں تو سنبوسوں کی خوبصورت کشتیاں رواں تھیں۔ کہیں شیرمالوں کے بجرے لنگر انداز تھے۔ اور پھر لطف یہ کہ اس نہر کا ہر بھنور باقرخانی تیار کرتا تھا اور ہر حباب سے ایک بتاشہ بنتا تھا میں دیر تک اس منظر میں گم رہا۔ آخر منجھو مرحوم نے مجھ سے کہا کہ چلو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے ریوڑیوں کی بارہ دری گزک کا قلعہ۔ فرینی کا کنواں۔ شربت کا آبشار۔ گاجر کے حلوہ کی

دلدل۔ گڑ کا پہاڑ وغیرہ" میں ان میں سے ہر چیز کا نام سنکر سخت حیران ہوا۔ اور نہایت خاموشی کے ساتھ منجھو مرحوم کے ساتھ چل دیا سب سے پہلے منجھو مرحوم نے مجکو ریوڑیوں کی بارہ دری دکھائی۔ اس بارہ دری کی ادنی تعریف یہ ہے کہ دیکھو تو دیکھتے رہجاؤ۔ اور کھاجاؤ تو ڈکار تک لینے کا ہوش باقی نہ رہے چھوٹی اور بڑی خوشبودار ریوڑیوں سے اس بارہ دری کو کچھ اس طرح بنایا گیا تھا۔ کہ ریوڑیوں پر جواہرات کا شبہ ہوتا تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ پچی کاری کے فن کو اس عمارت پر ختم کر دیا گیا ہے حیرت تو یہ ہے کہ اس عمارت کے ستون آپ کھاجایئے مگر وہاں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔ اور جو ریوڑی جس جگہ سے آپ کھائیں اس کی جگہ ویسی ہی دوسری ریوڑی موجود اگر یہ صنعت نہ رکھی گئی ہوتی تو اس بارہ دری کو لوگ کب کے ہضم کر چکے ہوتے۔ ریوڑیوں کی بارہ دری کے بعد گزک کا قلعہ بھی دیکھا۔ اماں یہ آگرہ اور دہلی کے قلعے اس کے سامنے بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں۔ اس قدر عظیم الشان قلعہ کہ جیسے پہاڑ کا پہاڑ کھڑا ہوا ہے اور کیا مجال کہ گزک کے علاوہ اس میں کوئی اور چیز لگی ہو میں نے اس قلعہ کی بھی ایک اینٹ نکال کر کھائی۔ اور آج تک اس کا مزہ بھولا نہیں ہوں حد یہ ہے کہ میں آگرہ وغیرہ کی گزک کو بھی اب نہیں چھوتا جس کو سب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ گزک کا قلعہ دیکھنے کے بعد فیرینی کے کنوئیں پر گیا اس کو کنواں کیوں کہا جائے یہ سمجھو کہ اچھی خاصی باؤلی ہے میں نے دیکھا کہ اس کنوئیں میں نہایت نفیس قسم کی خوشبودار فیرینی بھری ہوئی ہے جس پر چاندی کے ورق نہایت سلیقہ سے لگے ہوئے ہیں اور جس طرح عام طور پر کنوؤں میں کائی جم جاتی ہے اسی طرح اس کنوئیں میں بھی کائی جمی ہوئی تھی۔ مگر وہ کائی پستے اور بادام کی ہوائیوں کی تھی۔ منجھو مرحوم نے اس کنوئیں سے ایک سونے کا ڈول

کھینچا۔ اب جو میں اس فیرنی کو چکھتا ہوں تو روح تازہ ہو گئی معلوم ہوا کہ شکو میں لپیٹ کر چوپاٹی کھا گئے بھائی ایسی کھیر تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی حد یہ ہے کہ اب تک زبان میٹھی ہے خیر صاحب اس کنویں سے چل کر شربت کا آبشار دیکھا پھر گاجر کے حلوہ کی دلدل دیکھی اور آخر میں گڑ کا پہاڑ دیکھا مگر سچ پوچھو تو اس وقت حقہ کی کمی نہایت بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے منجھو مرحوم سے حقہ کا ذکر کیا اس نے فوراً ہی اپنے جیب سے ایک طلائی سنے نکال کر کہا "لو پیو" میں نے کہا آخر کیا پیوں نہ حقہ نہ چلم تم بھی بڑے مسخرے ہو"۔ تو منجھو مرحوم نے نہایت متانت سے کہا "بھائی یہ حقہ ہی ہے بات یہ ہے کہ یہ جنت ہے یہاں آگ نہیں آسکتی لہذا اس کی چلم تو ہے دوزخ میں اور نے آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دوزخ کے فرشتے برابر چلم بھرتے رہتے ہیں۔ ذرا تم پی کر تو دیکھو"۔ اب جو میں اس نے کا ایک کش لیتا ہوں تو آپ سے کیا کہوں کہ میرا کیا حال ہوا ایسا خمیرہ تو میں نے کبھی پینا کیا معنی کبھی گلستان بوستان میں بھی نہ دیکھا تھا معلوم یہ ہوا کہ جیسے اس کی خوشبو میرے جسم کے ہر حصہ میں دوڑ گئی۔ میں دیر تک حقہ پیتا رہا۔ آخر مجھکو خیال آیا۔ اور میں نے منجھو مرحوم سے کہا کہ ایسا حقہ مجھکو کہاں سے مل سکتا ہے "منجھو نے کہا۔ کہ یہ سب چیزیں جنت کے داروغہ سے مل سکتی ہیں"۔ اب تو مجھکو بھی جنت کے داروغہ سے ملنے کا خیال پیدا ہوا اور میں سیدھا ان کے دفتر کی طرف روانہ ہوا راستہ میں ایک عالیشان افیون کی عمارت دکھا کر منجھو مرحوم نے کہا کہ "یہ جنت کا کتب خانہ ہے اس میں طلسم ہوشربا، الف لیلہ۔ قصہ گل بکاولی۔ قصہ طوطا مینا اور تمام ان کتابوں کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے جو افیونیوں کے ذوق کی سمجھی جاتی ہیں خصوصاً طلسم ہوشربا کی باقی

دو سو پچاس جلدیں جو دنیا میں نایاب ہیں - اس کتب خانہ میں محفوظ ہیں مگر مجھکو تو اس وقت داروغہ جنت سے ملنے کی جلدی تھی - لہذا کتب خانہ کی عمارت کو باہر ہی سے دیکھتا ہوا ۔ داروغہ جنت کے دفتر پہونچ گیا۔ مجھو مرحوم کو باہر ہی چھوڑ کر میں خود دفتر میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں بظاہر تو کوئی نہیں ہے مگر میرے پہونچتے ہی ایک آواز آئی کہ "آپ کا نام" میں نے ڈرتے ہوئے کہا: "میر جعفر ہے اس غلام کا نام" پھر آواز آئی "باپ کا نام" میں نے حافظہ پہ زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا تو گھبرا کر کہدیا" غلام کو یاد نہیں "پھر آواز آئی" پیشہ" میں نے کہا: "صرف افیونی ہے یہ ناچیز" اس مرتبہ آواز ذرا تیز آئی کہ "کیا تم میر جعفر قلعی گر ابن میر باقر ہو" "نہیں" میں نے گھبرا کر کہا: "ہر گز نہیں وہ تو میرا ہم محلہ ایک غیر افیونی ہے" اس کے جواب میں مجکو یہ خبر سنائی گئی کہ میری روح غلطی سے قبض کرلی گئی ہے - دراصل موت آئی تھی اس قلعی گر کی لہذا اب جو میں وہاں سے پھینکا جاتا ہوں تو اپنی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اور سب کہہ رہے تھے۔ کہ میر صاحب مرے نہیں بلکہ پینک میں ہیں "

خاں صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا" اپنی اپنی تقدیر ہے بھائی تم کو جیتے جی جنت مل گئی "

مرزا صاحب نے کہا" خیر یہی معلوم یہ ہوا کہ جنت بھی ہے کام کی چیز -

اگر میں لڑکی ہوتا

حضرت جگر مراد آبادی نے ایک عجیب شعر بہت خوب کہا ہے ؎

خدا گواہ جو ہم آپ کی جگہ ہوتے
محبتوں کے خزانے لٹا دیا کرتے

مگر خدا جانے یہ شعر کس دنیا کے متعلق ہے اس لئے کہ ایک ہندوستانی عورت محبتوں کے خزانے کسی حالت میں لٹا ہی نہیں سکتی۔ ہندوستانی بہو بیٹیوں کے متعلق تو جب کبھی ہم غور کرتے ہیں۔ یہ شعر کچھ اس طرح ہمارے ذہن میں گونجنا شروع کر دیتا ہے کہ ؎

خدا گواہ جو ہم آپ کی جگہ ہوتے
تو ہم کو خود بھی یہی فکر ہے کہ کیا کرتے

یعنی اگر خدانخواستہ ہم اپنے والدین کے برخوردار سعادت آثار ہونے کے بجائے کہیں دختر نیک اختر واقع ہو گئے ہوتے تو عجیب مہمل زندگی ہوتی ہماری بھی یہ خیال ان لڑکیوں یا اُن عورتوں کے ذہن میں نہیں آ سکتا جو پیدائشی طور پر لڑکیاں یا عورتیں واقع ہوئی ہیں۔ مگر اس خیال اور اس خیال کی اہمیت کو لڑکی نہ بن سکنے والے لڑکے یعنی عورت بنکر نہ پیدا ہونے والے مرد ہی کچھ محسوس کر سکتے ہیں۔

کہ اگر وہ بجائے مرد بننے کے عورت یعنی بجائے لڑکا ہونے کے لڑکی بن جاتے تو کیا ہوتا۔ کم سے کم ہم اپنی حالت کا اندازہ خود ہی کر سکتے ہیں۔ کہ جب کبھی ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے تو غور کرتے کرتے الجھ گئے ہیں۔ الجھنے کے بعد اختلاج کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اور آخر کار کپڑے پھاڑ کر نکل بھاگنے کی حد تک پہونچ کر یہ خیال آیا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم مرد ہیں۔ ہم کو اس طرح پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ حالانکہ اگر ہم واقعی لڑکی ہوتے تو اپنی اسی زندگی کے عادی ہو کر رہ جاتے اور لڑکی ہونا ہمارے نزدیک کوئی مصیبت نہ ہوتا مگر لڑکا ہو کر لڑکی کی زندگی پر غور کرنا ہم آپ سے سچ کہتے ہیں نہایت بھیانک ہوتا ہے۔

میدانوں میں ہاکی اور کرکٹ کھیلنے والے لڑکے گھروں میں گڑیاں کھیلنے والی لڑکیوں کی زندگی کا تصور اس وقت تک کر ہی نہیں سکتے۔ جب تک کہ وہ ہماری طرح اس خیال کو اپنے اوپر طاری نہ کر لیں۔ کہ اگر ہم لڑکی ہوتے تو کیا ہوتا۔ ریشمی برقعہ پہن کر اونچی ایڑی کے جوتے کے ساتھ وحشی ہرنیوں کی سی چال کس نوجوان کو اچھی نہیں لگتی۔ زرق برق ساریوں میں سورج کی باریک کرن کی طرح تھرتھراتا کس لڑکے کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ گھنگھور گھٹاؤں کی طرح کے بال کون مرد پسند نہیں کرتا لیکن اگر یہی پسند آنے والی چیزیں ان پسند کرنے والے لڑکوں اور مردوں کے سامنے پیش کی جائیں۔ کہ اگر یہ برقعہ پسند ہے تو حاضر ہے یہ اونچی ایڑی کا جوتا اچھا معلوم ہوتا ہے تو ہماری طرف سے قبول فرمائیے یہ زرق برق ساڑی تو سے ہی لیجئے۔ اور ان گھنگھور گھٹاؤں کی طرح کے بالوں کو اپنے ہی سر اقدس کی زینت بنائیے تو ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ تمام لڑکے اور مرد سر پہ پیر رکھ کر بھاگیں گے اور ان ہی تمام پسندیدہ

چیزوں کو اپنے لئے نہایت خوفناک سمجھیں گے۔ اس لئے کہ دراصل وہ ان تمام چیزوں کو اپنے لئے نہیں بلکہ ایک عورت ہی کے لئے پسند کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان چیزوں کو قبول کرنے کے بعد خود ان کو اپنے متعلق عورت ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ لہذا وہ کانوں پر ہاتھ اور سر پر پیر رکھکر بھاگتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ خواہ کیسے ہی بدصورت مرد کیوں نہ ہوں مگر ان کو حسین سے حسین عورت بننا بھی گوارہ نہیں ہو سکتا ممکن ہے کہ اسی طرح عورتیں بھی مرد بننا پسند کرتی ہوں لیکن یہ افسوس تو ان کو ضرور ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے تو آخر مرد بنکر کیوں نہ پیدا ہوئیں کہ زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرتے یہ کیا کہ ایک طولانی موت کا نام زندگی رکھ چھوڑا ہے۔ اور خوش ہیں کہ زندہ تو ہیں۔ خیر صاحب ہم اس بحث کو یہیں پر ختم کئے دیتے ہیں ورنہ بہت سے حضرات کہیں گے۔ کہ یہ شخص عورتوں کو شہ دے رہا ہے حالانکہ مردوں کا یہ سمجھنا ہی مات کھا جانے کی علامت ہے۔

بہرحال ہم کو عرض یہ کرنا ہے کہ اگر ہم لڑکی ہوتے تو کیا ہوتا اس سلسلہ میں اپنی پیدائش سے لے کر تا دم تحریر تمام واقعات اگر تفصیل کے ساتھ نہیں تو اجمال کے ساتھ ہم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہماری اس زندگی کا اندازہ آپ کو ہو سکے جو بفضلہ مرد بنکر ہم کو بسر کرنا نہیں پڑی۔ لیکن اگر عورت پیدا ہو کر بسر کرنا پڑتی تو یہی ہوتا کہ جب ہماری پیدائش کی اطلاع والد صاحب کو ہوتی کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے تو وہ لڑکے کے منتظر والد صاحب دل میں تو یہی کہتے کہ۔ ع

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

مگر زبان سے کہتے کہ "اچھا بھائی پیدا ہوئی ہے تو خدا نصیبہ در کرے۔ اور

صاحب عمر، اس کے بعد ان کی گردن کچھ جھک سی جاتی۔ اور یہ ہوتا گویا یہ لڑکی کا خیر مقدم اسکے بعد مجکو لڑکا یا لڑکی سمجھکر نہیں بلکہ اپنا بچہ سمجھکر میرے والدین پالتے یہاں تک کہ میں اس قابل ہو جاتی کہ پڑھنے بٹھائی جاؤں لہذا میرے لئے ماسٹر صاحب نہیں بلکہ استانی جی مقرر ہوئیں اور میں اوڑھنی اوڑھ کر ان کے سامنے پڑھنے کو بیٹھا کرتی حالانکہ میرے بھائی ننگے سر اپنے ماسٹر صاحب کے پاس پڑھا کرتے۔ پڑھنے سے فارغ ہو کر میرے بھائی اچھل کود شروع کر دیتے لیکن اگر میں ذرا بھی دوڑتی تو اماں جان فوراً مجکو جھڑک دیتیں کہ "واہ یہ بھی کوئی لڑکیوں کا انداز ہے۔ کہ لڑکی ذات ہو کر لونڈوں کی طرح اچھلتی پھرتی ہے موئی گھوڑی جیسے" میں کھسیانی ہو کر اور اپنا دل مار کر سمٹ کر بیٹھ رہتی میرے بھائی شکار کو جاتے اور میں گڑیاں کھیلتی۔ میرے بھائی فٹ بال کھیلتے اور میں ہنڈکلھیا پکاتی میرے بھائیوں کو ورزش سکھائی جاتی اور مجکو سینا پرونا۔ میرے بھائی گھوڑوں پر سوار ہوتے اور میں پیڑھے پر بیٹھکر روٹی پکانا سیکھتی میرے بھائی اپنی بائیسکلوں پر فراٹے بھرتے ہوئے اسکول جایا کرتے اور میں اپنے اسکول کی بند لاری میں گھٹ گھٹ کر اسکول جایا کرتی۔ میرے بھائی اباجان کے ساتھ انکے دوستوں کے یہاں جایا کرتے۔ اور اماں جان میری وجہ سے خود بھی کہیں نہ جاتیں کہ جوان جہان لڑکی کو گھر میں کیسے چھوڑیں۔ اور سیانی لڑکی کو کسی کے یہاں لیکر کیونکر جائیں میرے بھائی اسکولوں سے نکل کر کالج میں داخل ہوتے اور میں اسکول ہی سے اٹھا لی جاتی۔ کہ اب لڑکی ماشاء اللہ سیانی ہو گئی ہے۔ اب اسکول بھیجنا ٹھیک نہیں ہے۔ کالج میں داخل ہو کر میرے بھائی گھر چھوڑ کر بورڈنگ میں چلے جاتے اور اسکول چھوڑ کر میرے سر تمام گھر کا انتظام آپڑتا۔ اور اماں جان صرف معمولی سی نگرانی کیلئے

رہ جاتیں۔ یہاں تک کہ میری وہ عمر آجاتی۔ کہ ابّا جان کو اور ابّا جان سے بہت زیادہ اماں جان کو دن رات یہی فکر ہوتی کہ کیونکر مجھ کو گھر سے نکالیں ان کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام اسی فکر میں حرام ہو جاتا وہ تو وہ آئے گئے سب ہی کو میری صورت دیکھ کر یہی فکر ہوتی کہ آخر میں اب تک اس گھر میں کیوں ہوں۔ جٹھرانی ہے تو اماں جان سے تقاضہ کر رہی ہے کہ "بیوی اب تو ہماری بٹّن کا بیاہ ہو جانا چاہیئے۔" دھوبن ہے تو اس کو یہی غم کھائے جاتا ہے کہ "بٹیا کی بات کہیں لگی یا نہیں" منہارن ہے کہ چوڑیاں پہناتی جاتی ہے اور یہی کہتی جاتی ہے کہ "اللہ رکھے یہی شادی کے دن ہیں جوان جہان لڑکی کا بٹھائے رکھنا ابھی تو ٹھیک نہیں۔" اور اماں جان ان تمام تذکروں پر اس طرح ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتیں کہ گویا واقعی تمام دنیا کے لڑکے رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ اور میں بیٹھی رہ گئی۔ میں رات کے سناٹے میں اپنے بستر پر لیٹ کر ابّا جان اور اماں جان کی اسی معاملہ میں جھڑپ سنا کرتی کہ اماں جان نے رازدارانہ طریقہ پر پوچھا کیا سو گئے۔

ابّا جان نے حقّہ گڑگڑاتے ہوئے کہا "نہیں تو ابھی سو جاتا کیا؟"

اماں جان نے کہا "میں کہتی ہوں کہ آخر لڑکی کو کب تک کلیجہ سے لگائے بیٹھے رہو گے"

ابّا جان نے جواب دیا "تو آخر تمہارا مطلب کیا ہے کیا میں کسی راہ چلتے کے ہاتھ پکڑا دوں؟"

اماں جان نے کہا "نہیں میں کہتی ہوں کہ تم تو کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہوئے ہو"

ابا جان نے جل کر کہا "تو آپ ہی کانوں کا تیل نکال کر کوئی فکر کریں مجھ سے یہ تو نہیں ہو سکتا۔ کہ میں لڑکی کو جان بوجھ کر کسی گڑھے میں جھونک دوں"

اماں جان نے کہا "آخر وہ تحصیلدار کے لڑکے کا کیا ہوا"

ابا جان نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ اجی وہ سخت نالائق ہے آوارہ گرد سنا ہے کہ ناچنے گانے کا بھی شوق ہے"

اماں جان نے کہا "اور وہ جو بھوپال سے نسبت آئی تھی"

ابا جان نے کہا "جی ہاں ان حضرت کے متعلق معلوم ہوا کہ بھائی صاحب مرحوم کی عمر کے ہیں"

اماں جان نے کہا "کیا سچ مچ عمر زیادہ ہے لڑکے کی"

ابا جان نے کہا "ہاں صاحب وہ لڑکا نہیں ہے لڑکوں کا دادا ہے"

اماں جان نے کہا "لڑکے اور لڑکی میں بیس برس تک کا فرق ہو تو خیر مگر اس سے زیادہ نہیں"

ابا جان نے کہا "تو آپ گویا مجھ سے بیس برس چھوٹی ہیں"

اماں جان نے جل کر کہا "اے ہٹو بھی تمہارا کون ساز کر رہا ہے یہاں۔ چلے وہاں سے بوڑھا چونچلا لیکے"

ابا جان نے کہا "میرے خیال میں تم مجھ سے دو چار سال خود ہی بڑی ہو گی"

اماں جان نے اور بھی جل کر کہا "اور کیا ایسے ہی تو ننھے ہو چھوٹے"

ابا جان ہنس کر چپ ہو گئے ہوتے مگر اماں جان دیر تک ان بھوپال والے

بڑے میاں کی تائید میں ابا جان کو سمجھاتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ تو دونوں سو جاتے مگر میری نیند اڑ جاتی۔ کر یا اللہ کیا میں ای کھونسٹ۔ کے پالے پڑوں گی جس کے نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ تمام رات ان بڑے میاں کا خوفناک خیال ستاتا رہتا۔ اور اس حد تک میں پریشان ہو جاتی۔ کہ رونے کو دل چاہتا مگر زبان سے ایک لفظ نہ کہہ سکتی کہ للہ مجھ کو اس ٹوٹی ہوئی قبر میں دفن نہ کرو۔ اگر واقعی وہ کمبخت اتنا ہی بوڑھا ہے تو اس موئے کے جسم سے تو کافور کی بو بھی آتی ہو گی۔ اور اس کے جسم پر ہر لباس کفن معلوم ہوتا ہو گا۔ مگر ہمارے خاندان کی بہو بیٹیاں ان معاملات میں گونگی اور بہری دونوں ہوتی ہیں۔ لہٰذا میں بھی کچھ نہ کہہ سکتی۔ البتہ نہایت رشک کے ساتھ اپنے بھائیوں کو دیکھتی کہ وہ نہایت آزادی کے ساتھ اپنی شادیوں کا ذکر کرتے اور اپنی دلہنوں کے لئے آزادی سے شرائط پیش کرتے۔ کہ صاحب پہلے لڑکی کو ہم خود دیکھیں گے۔ اور صاحب پہلے لڑکی کی تصویر آنا چاہیے۔ وہ انگریزی بھی جانتی ہے یا نہیں۔ اس کے بال کتنے بڑے ہیں۔ اور اس کی آواز کیسی ہے۔ میں حسرت سے اپنے بھائیوں کی اس آزادی کو دیکھتی اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ اماں جان میرے بھائیوں کی اس بے باکی پر ہنس دیا کرتیں۔ لیکن اگر میری زبان سے ایک لفظ بھی میری شادی کے متعلق سن لیتیں تو گویا اپنی عزت آبرو کے جنازہ پر کہرام مچا دیتیں۔ لہٰذا میں چپ رہتی۔ خواہ وہ کسی کے ساتھ میری شادی کر دیتیں۔ البتہ دل ہی دل میں یہ فکر مجھ کو بھی پریشان رکھتی کہ دیکھئے میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اور میں کس کے حوالے کی جاتی ہوں اگر کسی نسبت کا ذکر سنتی تو دل کو ایک کھوج

سی ہوتی کہ یہ صاحب کون ہیں۔ اور کیا ہیں مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکتی آخر کار ایک دن میں ابا جان کو اماں جان سے یہ کہتا ہوا بھی سن لیتی کہ :۔

"میرے نزدیک یہ نسبت ہر طرح بہتر ہے۔ یہ دیکھو لڑکے کی تصویر ہے"

اماں جان تصویر دیکھکر کہتیں "اے ہے لڑکا دبلا کتنا ہے کہیں کوئی عارضہ تو نہیں ہے"

ابا جان کہتے "لاحول ولا قوۃ جو بات کہتی ہو ایسی ہی کہتی ہو۔ نہایت اچھی تندرستی ہے اس کی۔ شریف گھرانے کا ہے۔ روزگار سے لگا ہوا ہے۔ ایک اخبار کا اڈیٹر ہے بہت سی کتابیں لکھ چکا ہے۔ اور کافی مشہور آدمی ہے"

اماں جان کہتیں کہ "چشمہ تو دیکھو کیسا موٹا سا لگائے ہوئے ہے"

ابا جان جل کر کہتے "توبہ ہے۔ یہ فضول باتیں کرو گی اور کوئی صاف بات نہ بتاؤ گی۔ کہ ان کو جواب کیا دیا جائے"

اماں جان کہتیں یہ تو میں کیا بتاؤں تم کو اگر اطمینان ہو تو بسم اللہ کرو"

ابا جان کہتے "ہاں مجھکو اطمینان ہے لڑکا سمجھا بوجھا ہوا ہے اور ہر طرح مناسب ہے"

اماں جان بھی راضی ہو جائیں اور ابا جان تو گویا پہلے ہی سے رضامند تھے مگر میں یعنی جس کا اصل معاملہ ہوتا وہ گویا کوئی چیز ہی نہیں۔ مگر مجھکو قدرتی طور پر فکر ہوتی کہ جن صاحب کے لئے میرا مالک ہو جانا طے کر دیا گیا ہے۔ وہ آخر ہیں کون؟ میرا دل چاہتا کہ تصویر بھی دیکھوں مگر نہ دیکھ سکتی آخر میری سہیلیاں مجھکو چھیڑ چھیڑ کر اور گد گدا کر ان صاحب سے غائبانہ طور پر متعارف کرائیں۔ اور میں یہ سمجھ کو مطمئن

ہو جاتی۔ کہ خیر جو کچھ بھی ہو اور وہ جیسے بھی ہوں مگر کم سے کم بھوپال والے بڑے میاں تو نہیں ہیں ——— یہاں تک کہ میری شادی کے لئے دن اور تاریخ مقرر ہوتی۔ اور ایک دن شالیاف میں مجھکو لپیٹ کر بٹھا دیا جاتا۔ اور نکاح کے وکیل آکر مجھ سے پوچھتے کہ "میں نے اپنی وکالت میں تمہارا نکاح شوکت تھانوی ولد منشی صدیق احمد صاحب کے ساتھ بعوض پندرہ ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت۔ کیا تم کو منظور ہے" میں اس وقت کچھ بن بن کر اور کچھ واقعی سسکیاں لے لے کر روتی اور آخر کار تیسری مرتبہ نکاح کے وکیل کے جواب میں مجھکو خفیف سا "ہوں" کہنا پڑتا اور یہیں سے میری دنیا بدل جاتی۔

اپنے نکاح کے بعد میں شوکت دلہن کہلاتی اور جیسی کچھ بھی میری زندگی ہوتی میں اسی میں خوش رہتی۔ میرے مزاح نگار شوہر مجھ کو اپنا موضوع مزاح بناتے اور میں اس بات پر ان سے لڑا کرتی۔ آخر کار تھوڑے دنوں کے بعد اس بات کی عادی ہو جاتی۔ میرے وہ بچے ہوتے جو مجھکو اپنی تتلی زبان سے امی جان کہتے۔ اور میں ان کو دیکھ دیکھ کر پھولی نہ سماتی ——— مگر الحمد للہ کہ میں لڑکی نہیں لڑکا ہوں عورت نہیں مرد ہوں ——— شوکت دلہن نہیں شوکت تھانوی۔

تکلفات

تھانوی ہونا دوسری بات ہے مگر یہ خاکسار حاضر ہوا ہے ابھی لکھنؤ سے جہاں "پہلے آپ" اور "نہیں حضرت پہلے آپ" کے تکلفات میں ٹرین چھوڑ دی جاتی ہے مگر وضع نہیں چھوڑی جاتی۔ اب ذرا اس خاکسار کا لکھنؤ سے حاضر ہونا ملاحظہ فرمائیے اور گنتی کے پندرہ منٹ ریڈیو پر مضمون پڑھنے کے لئے دیکھئے۔ انصاف سے کہئے گا کہ ایک لکھنؤ سے آنے والا اسما پندرہ منٹ میں کتنی دیر اپنی شیروانی کا دامن درست کر کے ایک مناسب زاویہ سے بیٹھنے کی کوشش کرے گا کتنی دیر میں پشمین رومال سے لبوں کو صاف کرے گا۔ کتنی دیر کھنکھار کر آواز کے سُر درست کرے گا۔ کتنی دیر شرمائے گا اور کتنی دیر اس کا انتظار کرے گا کہ سامعین "ارشاد" کہکر تقاضہ کریں۔ یہاں کل پندرہ منٹ ہیں حالانکہ یقین جانئے کہ ان میں سے ہر ادا کے لئے فرداً فرداً پندرہ پندرہ منٹ کی ضرورت ہے اور اس کے بعد بھی یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ مضمون سنایا بھی جائے اس لئے کہ بہت ممکن ہے کہ یہ خاکسار لکھنؤ سے حاضر ہونے کی رعایت سے محض ناسازی طبع۔ یعنی زکام، نزلہ، گلو گرفتگی، اختلاج قلب، دوران سر وغیرہ وغیرہ تمام ممکن اور ناممکن امراض کو بطور عذر پیش کر کے معذرت چاہے اور پھر جب

تمام ہندوستان کے ریڈیو تو از بعینہٖ غائب اور ریڈیو اسٹیشن دہلی والے بعینہٖ حاضر اس خاکسار سے اصرار کریں تو یہ کمترین گویا مجبور ہو کر محض تعمیل ارشاد میں ایک شعر حاصل مضمون روانی کے ساتھ سنا جائے مگر ان تمام مراحل کو طے کرنے کے لئے منٹوں کی نہیں بلکہ گھنٹوں کی ضرورت ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ گھڑی دیکھتے رہو جیسے ہی چھوٹی سوئی آٹھ پر اور بڑی بارہ پر پہنچے فوراً شروع کر دو اپنا مضمون جو ایک ایک سکنڈ کے حساب سے ٹھیک اس وقت ختم ہو جائے جبکہ بڑی سوئی تین پر پہونچ جائے گویا ہم لکھنؤ سے آنے والے ایک آدمی نہیں ہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ سے آنے والی کوئی ٹائم پیس ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کو اس باقاعدگی اور تہذیب کے مقابلہ میں شیخ ابراہیم ذوق سے اتفاق ہو جن کا نظریہ یہ تھا کہ ؎

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

مگر غور کیجئے تو یہ تعلیم سوائے خود غرضی کے اور کچھ نہیں سکھاتی یقیناً آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے مگر جس کے ساتھ تکلف نہیں کرتے اس غریب کی کیا گت بناتے ہیں اس پر بھی تو غور کرنا چاہیئے یہ کیا کہ محض اپنی تکلیف دور کرنے کی تو ایک راہ نکال لی اس کے بعد تمام دنیا گئی جہنم میں۔ لیکن لکھنؤ کا تکلف، ایثار، قربانی، نفس کشی اور اسی قسم کی خدا جانے کتنی خوبیاں سکھاتا ہے۔ اس تکلف کے ماتحت انسان ہر مصیبت خود ہی جھیل لیتا ہے یہ نہیں کہ بے تکلف بن کر دوسروں کے لئے

عذاب بن جائے مارے بے تکلفی کے بغیر کسی اطلاع کے رات کو ٹھیک دس بجے نازل ہو گئے کسی دوست کے یہاں اور مان نہ مان میں تیرا مہمان کے اصول پر عمل کرتے ہوئے طلب کیا اُس سے کھانا مع چند فرمائشات کے جن کی تعمیل کے لئے خواہ وہ چوری کرے یا بال بچوں کا پیٹ کاٹے کسی سے قرض لائے یا خود پیٹ پر پتھر باندھکر سو رہے مگر آپ کی بلا سے آپ کو اپنے کام سے کام۔ ایسے مہمان کے لئے میزبان کے دل کی گہرائیوں سے جو بد دعائیں نکلتی ہیں وہ قبول ہوتی ہوں یا نہ ہوتی ہوں مگر شیخ ابراہیم ذوقؔ کی روح ضرور شرمندہ ہوتی ہوگی کہ وہ کیسا غلط نظریہ قائم کر گئے ہیں ایک لکھنوی صاحبِ تکلف کے لئے اس قسم کی بے تکلفی قطعاً ناممکن ہے وہ اگر ناوقت کسی شہر میں پہونچے گا بھی تو اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہلنگ کر کے دیوار پر چسپاں ٹائم ٹیبل کو بار بار دوہرا اور ہجے لگا کر پڑھ کر۔ میر تقی میر کی غزلیں گنگنا کر وقت کاٹ دے گا اور صبح شریف آدمیوں کی طرح مہمان بنکر میزبان کے دروازہ پر پہونچے گا اور اس وقت بھی یہ عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ جب میزبان ناشتہ چنے گا تو یہ مردِ معقول جو بلا مبالغہ دو تین فاقوں سے ہوگا یہی کہیگا کہ حضرت میں تو ناشتہ کر کے حاضر ہوا ہوں اب یہ اور بات ہے کہ قسماً قسمی اور اصرار سے مجبور ہو کر اسی ناشتہ کو اس صفائی سے تناول فرما جائے کہ صرف میزبان کو تکلفاً چھوڑ دے

ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ لکھنؤ کے تکلف کو دنیا نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس کا مذاق اڑا کر اس کے فوائد کو نظر انداز کر دیا ورنہ یہی تکلف اُن تمام سیاسی ہندوستانی اور بین الاقوامی مسائل کا واحد حل ثابت ہوتا جو آجکل منکرین عالم اور

مدبرین وقت کا دماغ چرخ کیے ہوئے ہیں۔ بے تکلفی اور اکھڑ پن ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ تخفیف اور توسیع اسلحہ کی گتھی کسی طرح سلجھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہندوستان کے لیے جدید دستور کی بھی ضرورت پیش آرہی ہے اور چین وجاپان میں اناکشیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام دنیا میں ایک آگ لگی ہوئی ہے اور امن وسکون کا کہیں پتہ نہیں۔ کاش تکلف کو اس طرح نظر انداز نہ کیا گیا ہوتا اور بجائے اسکے کہ آج تخفیف اور توسیع اسلحہ کی گتھیاں سلجھائی جارہی ہیں یہ ہوتا کہ جرمنی برطانیہ کو لکھتا کہ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو ہمیں ایک ہزار توپیں بنانا چاہتا ہوں اسکے جواب میں برطانیہ پانچسو توپیں مع اس مضمون کے خط کے بھیجدیتا کہ آپ نے غیریت برتی۔ اور بجائے برطانیہ سے توپیں طلب کرنے کے خود توپیں بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ بہرحال اس وقت برطانیہ کے پاس پانچسو توپیں تیار تھیں جو ارسال خدمت ہیں۔ باقی انشاء اللہ بہت جلد تیار کر کے روانہ کی جائیں گی۔ مگر آپ کو ہمارے سر کی قسم کہ ان کو اپنی ہی چیز سمجھکر قبول فرمائیے گا۔ اور آئندہ بھی خدمات لائقہ سے یاد فرماتے رہیئے گا۔ اس کے جواب میں جرمنی کی طرف سے ان توپوں کی قیمت روانہ ہوتی اور پھر مسٹر بالڈون اور ہرہٹلر کے درمیان اس قسم کے بحری پیغامات کا سلسلہ شروع ہوجاتا کہ "نہیں حضرت یہ نہ ہوگا"!

"نہیں حضرت یہ نہ ہوگا"!

"واللہ بھائی بالڈون آپ کو یہ دام تو قبول ہی کرنا پڑیں گے"!

"آپ کے سر عزیز کی قسم ہٹلر صاحب یہ قیامت تک نہ ہوگا"!

"اے حضرت آپ کی توپیں ہماری تھیں تو ہمارا روپیہ آپ کا ہے"!

"یہ صحیح ہے مگر آپ غیریت برت رہے ہیں"

"اس رقم کو واپس کر کے دلشکنی نہ فرمایئے"

"یہ رقم اور وہ توپیں سب آپ پر نچھاور ہیں"

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ آئندہ کوئی فرمائش نہ ہو"

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں فرمائش غیروں میں ہوتی ہے یہاں جو کچھ ہے آپ کا ہے"

"تو پھر آپ کو ہمارے سر کی قسم اس روپیہ کو بھی اپنا ہی سمجھئے"

"اچھا آپ نے دیدیا ہم نے پالیا اب یہ ہماری طرف سے جرمن قوم کے بچوں کو مٹھائی کے لئے دیدیجیئے"

"قسم ہے ہمارے قومی جھنڈے کی جان عزیز کی کہ یہ نہ ہوگا"

"آپ تو واللہ مجبور کر رہے ہیں"

"اچھا تو اس کے معاوضہ میں نہ سہی تحفتاً دو چار سو ہوائی جہاز ہی قبول کر لیجئے"

"اس کی بھلا کیا ضرورت ہے"

"ضرورت نہیں ہماری خوشی ہے"

"آپ کی خوشی ہے تو اچھا یہی سہی"

اب آپ ہی بتایئے کہ اس قسم کے رسم اور ان تعلقات کے بعد تخفیف یا توسیع اسلحہ بیکار نہیں تو اور کیا ہے زیادہ سے زیادہ آپ اس ناممکن بات کا ممکن ہونا فرض کر سکتے ہیں کہ شاید جنگ چھڑ جائے۔ مگر جنگ میں بھی اس تکلف کی کارفرمائی جس حد تک مفید ہو سکتی ہے اس کا تصور بھی بے تکلف دنیا نہیں کر سکتی

جنگ اول تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہو بھی گئی ہوتی تو دونوں حریف ایک دوسرے کے مقابلہ پر برسوں صف آرا کھڑے رہتے اور حملہ کے سلسلہ میں دونوں طرف سے یہی اصرار ہوتا کہ پہلے آپ اور "نہیں حضرت پہلے آپ"

رونا تو آتا ہے اس گہوارۂ تکلف ہندوستان پر آج یہاں بھی تکلف کا نام و نشان نہیں ہے کہیں جدید دستور کی ضرورت ہے اور کہیں جدید دستور کے لئے ہڑتال کی ضرورت ہے کہیں حقوق کا سوال ہے اور کہیں۔ ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

حالانکہ اگر غور کیجئے تو تکلف کے نقطۂ نظر سے ہندوستانیوں کا حقوق طلب کرنا ہی نہایت بھونڈی اور گری ہوئی بات ہے۔ ہمارے بزرگ اگر اپنی کوئی چیز کسی کو دیتے تھے تو اس طرح سے کہ ایک ہاتھ سے وہ چیز دی اور دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوئی اور صرف یہی نہیں بلکہ مرتے دم تک پھر اس چیز کا نام تک زبان پر نہ آتا تھا۔ اس کو واپس مانگنا یا اس کا معاوضہ لینا تو درکنار۔ خواہ پھر فاقوں پر نوبت ہی پہنچ جائے یا چیتھڑے لگ جائیں مگر جان کے ساتھ آن نہیں جا سکتی تھی۔ اور ایک آجکل کا زمانہ ہے کہ سرکار کو جو ہندوستان دیا تھا اسی کو نہایت فخر کے ساتھ طلب کیا جا رہا ہے نہ ہوئے یہ کانگریس والے لکھنوی ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اگر سرکار خود بھی ہندوستان واپس دینا چاہتی تو یہی کہا جاتا کہ کیوں سرکار اب یوں بھی ذلیل کیا جائے گا ہم کو۔ واللہ اس قدر ذلیل تو نہ کیجئے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اب کسی قابل نہیں ہیں مگر اب ایسے بھی گئے گذرے نہیں کہ اپنی دی ہوئی چیز واپس لیں۔ کاش ہم اس قابل ہوتے کہ

ایسے ایسے پچاس ہندوستان آپ پر قربان کر دیئے مگر کیا کہیں کہ۔ ع

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ہندوستان کے سلسلے میں اپنا پرایا کیا آخر ہم خود کس کے ہیں یقین جانئے کہ آپ کے غلام ہیں اور آپ ہیں کہ ہم ہی سے یہ غیریت برت رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس شریفانہ تکلف کے جواب میں سرکار کی طرف سے بھی کوئی ٹکل نہیں ہو سکتا تھا مگر جب ہندوستان ہی نے تکلف چھوڑ دیا ہے تو دوسروں کا کیا سوال۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقوق کے سلسلہ میں اعداد و شمار اور فیصدی تک کے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں حالانکہ پہلے ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کو حسابِ دوستاں در دل کہکر ٹال دیا جاتا تھا اور حد یہ ہے کہ اسی بکھیڑے سے بچنے کے لئے اگلے وقتوں کے لوگ دس سے زیادہ گنتی ہی نہیں جانتے تھے۔ اور جس کو آجکل گیارہ کہا جاتا ہے اس کو وہ بھولے بھالے شرفاء دس کے اوپر ایک کہا کرتے تھے۔ اور امن وسکون کی نہایت شریفانہ زندگی بسر کرتے تھے نہ حقوق نیابت کا سوال تھا نہ مشترکہ اور جداگانہ انتخاب کی کوئی بحث نہ مسجد اور باجہ کا سوال تھا نہ صوبجاتی اور مرکزی آزادی کا کوئی جھگڑا نہ انتخابات کا جھگڑا تھا نہ الکشن بازی بلکہ اس قسم کے تمام جھگڑے نہایت غیر مضرت رساں طریقہ پر بٹیر بازی سے پورے کر لیے جاتے تھے۔ آپ نے بٹیر بازی کا مضحکہ اڑایا مگر اس انسانوں کی پالی یعنی الکشن پر غور نہ کیا کہ یہ کیا ہے۔ بٹیر کا کیا وہ تو ایک ادنیٰ سا جانور تھا۔ فرض کر لیجئے کہ بھاگ گیا تو بھگا کہلایا اور زخمی ہوا تو چتھا کہا گیا مگر اس دورِ ارتقاء میں یہ رجعت قہقری ملاحظہ ہو کہ بٹیروں کی جگہ انسان نے لے لی ہے اچھے دل بڑے ہوتے ہیں۔ بٹیر چھٹے نہیں ہوتے بلکہ انسانوں میں سر پھٹول ہوتی ہے۔

اور اسی پر سب کو بڑا ناز ہے لکھنؤ کا تکلف تو ایک ڈھکوسلا تھا مگر یہ تمام باتیں آخر کیا ہیں ؟

خیر یہ تمام باتیں تو اس لئے عرض کر دیں کہ بات میں بات پیدا ہو گئی تھی اور مقطع میں نہیں بلکہ مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات پیدا ہو گئی تھی جس سے مقصود ترک صحبت نہیں ہے بلکہ محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ تکلفات کو چھوڑنے والے کس حد تک غلط راستہ پر ہیں۔ لیکن ایک لکھنؤ سے حاضر ہونے والے کے لئے یہ کسقدر دقت کی بات ہے کہ وہ اس روایتی تکلف کو یک لخت نظر انداز کر دے اور گھڑی کی سوئی کے اشاروں پر عمل پیرا ہو کر مضمون سنانا شروع کر دے پھر لطف یہ کہ سنائے تو کس کو سنائے ماحول یہ ہے کہ ایک تنہا کمرہ ہے جس میں بیٹھے ہوئے مضمون پڑھ رہے ہیں آواز بلند۔ یہ سچ ہے کہ ع

ساری دنیا گوش بر آواز ہے

مگر بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قید تنہائی میں باغیانہ تقریر کرنے کی مشق کر رہے ہیں یا در و دیوار سے باتیں ہو رہی ہیں۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ جب ہم سامعین سے سمع خراشی کی معذرت نہ چاہیں اور سامعین ہر جملہ پر نہ سہی جا بجا مکرر ارشاد نہ کہیں تو سنانے والے کا کیا خاک دل لگے گا۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ ہم بالکل آلہ نشر الصوت کے رحم و کرم پر ہیں۔ اور آلہ نشر الصوت سے زیادہ ہندوستان کی موسمی حالت پر ہمارے اس مضمون کی تقریر کا انحصار ہے۔ فرض کر لیجئے کہ کہیں بادل گرج رہا ہے تو سننے والے یہی کہیں گے۔ کہ سخت بدتمیز ہے یہ شخص بھی مضمون سناتے ہوئے اس قدر واضح قسم کی

ڈکار لیتا ہے۔ بلکہ اکثر حضرات کو تو یہ محسوس ہو گا۔ کہ مضمون سناتے سناتے اس خاکسار پر چھت پھٹ پڑی ہے یا یہ خاکسار مع کرسی اور میز کے الٹ گیا ہے۔ بہر صورت خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ ایک مضمون سنانے والے کی کیا کیا گت بنتی ہوگی۔ مگر یہ تمام باتیں اگر مقدرات سے وابستہ سمجھ لی جائیں تو بھی ریڈیو والوں کو اس کا خیال تو رکھنا ہی چاہیئے کہ ایک پنجابی اور ایک بنگالی ایک سرحدی اور ایک لکھنوی سب کے لئے پندرہ منٹ کی قید تو ایک قسم کی زیادتی سی ہے نا چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اسی تمہید میں مضمون سے قبل پندرہ منٹ ختم۔

اگر میں بادشاہ ہوتا

رعایا کے دماغ کی خرابی یہی ہے کہ وہ اپنے بادشاہ ہو جانے کا خیال ذہن میں لائے مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ بات ایک بادشاہ کے سوچنے کی نہیں ہو سکتی۔ کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو کیا ہوتا یہ بات تو وہی سوچ سکتا ہے جو بادشاہ نہ ہو اور چونکہ ہم بادشاہ نہیں ہیں لہٰذا اکثر فرصت کے اوقات میں یا بستر پر لیٹ کر سونے سے قبل غنودگی کے عالم میں یہ خیال ذہن میں آیا کرتا ہے کہ ہم بادشاہ ہوتے تو کیا ہوتا اس کے علاوہ اکثر بادشاہوں کے مقبرے دیکھ کر بھی یہ خیال پیدا ہوا ہے یا اس قسم کے خیالات ذہن میں آنے کا وقت وہ ہوتا ہے جب پیٹ بھر کر کھانا مل چکا ہو اور دوسرے وقت کے متعلق یہ علم ہو جائے کہ گھر میں جنس موجود ہے یا بیوی اپنے میکے جا چکی ہوں اور ضروریات زندگی کی یاد دہانی کرانے والا کوئی موجود نہ ہو۔ اس قسم کے تمام مواقع پر انسان یا تو گنگناتے گنگناتے شعر کہنے لگتا ہے یا کوئی نیا راگ دریافت کرتا ہے۔ اور اگر بالکل ہی خالی الذہن ہوا تو پھر یہی غور کرتا ہے۔ کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اس غور و فکر میں اس قدر منہمک ہوتا ہے کہ آخر کار اس کو نیند آجاتی ہے۔ ورنہ وہ پاگل ہو کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دے اور پاگل خانہ بھیجدیا جائے۔

معلوم نہیں کہ اس قسم کے خیالات پاگل ہو جانے کی علامت ہوتے ہیں یا اہل
ہوش پر بھی اس قسم کے جنون کا دورہ پڑ سکتا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو مگر ہم کو اعتراف
ہے کہ ہم ایک مرتبہ سے زیادہ اس بات پر غور کر چکے ہیں کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے
تو کیا ہوتا۔ اور ہر مرتبہ اس خیال کو بالکل نئی صورت اختیار کرتے ہوئے دیکھا
ہے مثلاً کبھی تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے ہیں اور پھر تھرڈ کلاس کی کشمکش میں تمام
رات اس طرح بسر کرنا پڑی کہ اپنے متعلق یہ فیصلہ کر سکیں کہ ہم آدمی ہیں یا کسی کے
اسباب ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ ہماری بھی کیا
زندگی ہے۔ اور ہم میں اور ہماری گٹھڑی میں کیا فرق ہے وہ بھی رکھی ہوئی ہے
اور ہم بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ہم یقیناً آدمی نہیں بلکہ اسباب ہیں اگر آدمی ہوتے
تو بجائے تھرڈ کلاس کے آدمیوں کی طرح سکنڈ کلاس میں سفر کرتے ٹانگیں پھیلا کر
سوتے پنکھے کے فراٹوں سے ہوا لیتے اور گدگدے گدے ریل کی ہر جنبش کے ساتھ
ہم کو پالنے کا لطف دیتا یا اگر اور بڑے آدمی ہوتے تو فرسٹ کلاس میں سفر کرتے
اور اپنے برتھ کو گھسیٹ کر چارپائی بنا لیتے پھر نہ تو اونگھنے کی ضرورت ہوتی نہ
گھٹنوں کے درمیان سر کے غائب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا۔ اور نہ اس کا خطرہ کہ
اگر ہم اپنی جگہ سے ہلے تو یہ جگہ بھی ہاتھ سے جائے گی۔ بلکہ فرسٹ کلاس میں تو اسقدر
کافی جگہ تھی کہ خواہ ہم ایک ہی برتھ پر سوئیں خواہ اسقدر پھیل پھیل کر سوئیں کہ ایک برتھ
پر ہاتھ سو رہا ہے تو دوسرے پر ٹانگیں تیسرے پر سر ہے تو پوچھنے پر کچھ۔ مختصر یہ کہ
کوئی پوچھنے والا نہیں حد یہ ہے کہ رات کو تھرڈ کلاس کی طرح ٹکٹ چیکر بھی ہمارا گھٹنا
ہلا کر ٹکٹ طلب نہیں کر سکتا بلکہ وہ رات کو ہمارے درجہ میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا کہ

مبادا ہماری فرسٹ کلاس نیند میں کوئی خلل نہ واقع ہو جائے دراصل آدمی تو وہ ہوتے ہیں جن کے لیے ٹرین میں خاص سیلون لگائے جاتے ہیں اور وہ سیلون کیا ہوتے ہیں اچھا خاصہ دولت خانہ ہوتے ہیں۔ رہ گیا گورنر کا اسپیشل یا وائسرائے کی خاص گاڑی اس کا تو خیر پوچھنا ہی کیا اگر ایسی گاڑیوں میں سفر کرنے کا ہم کو موقع ملے تو ہم شاید اپنے گھر پر رہنا ہی چھوڑ دیں۔ اور ہر وقت اسپیشل ٹرین میں بیٹھے ادھر سے ادھر پھرا کریں۔ بادشاہ سلامت کی گاڑی اس سے بھی زیادہ پر تکلف ہوتی ہوگی۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو یہ پر تکلف گاڑی ہم کو بھی ملتی۔ اور ہم اس شان کے ساتھ سفر کرتے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے۔ ہم خاص طور پر اپنی گاڑی نہایت اعلیٰ درجہ کی بنواتے اس میں ہمارے سونے کا کمرہ علیحدہ ہوتا جس میں سونے کی مسہری پر ریشمی پردے پڑے ہوتے اور مخملی بستر بجائے خود خواب آور ہوتا یہ بستر ایسا ہوتا کہ اس کو کھولنے اور باندھنے کی زحمت اٹھانا نہ پڑتی۔ غسل خانہ الگ ہوتا اور دفتر کا کمرہ الگ۔ ڈرائنگ روم بھی ہوتا اور تاش کھیلنے کا کمرہ بھی مختصر یہ کہ اس ٹرین میں ہر وہ چیز ہوتی جو ایک انسان کے ذہن میں آسکتی ہے۔ پیانو۔ ریڈیو اور بائیسکوپ تک اس ٹرین میں ہمارے لیے موجود ہوتا۔ اور ہم غربت میں بھی گویا گھر ہی پر ہوتے یعنی ریل کیا ہوتی گویا محل کے پیر لگ جاتے اور وہی ہمارے اشاروں پر دوڑتے ہوئے نظر آتے۔ اس قسم کے خیالات کا سلسلہ اس وقت منقطع ہوتا ہے جب کہ ٹرین کسی اسٹیشن پر ٹھہرے اور بہت سے دیہاتی ٹڈی دل یا کسی میلے سے بھاگے ہوئے مویشی نما انسان یا کچھ گھبرائے ہوئے براتی یا بے شمار مارواڑی معہ اہل و عیال اس تھرڈ کلاس پر یکایک حملہ کرتے ہیں اور ان کو روکر سمجھانا پڑتا ہے

کر بھائی تم کس چیز پر بیٹھے رہتے ہو وہ کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ ہم سب یعنی ہمارا سر ہے مگر باوجود اس کے وہ سر ہی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس تمام شاہی طلسم خیالی کو توڑ کر صرف یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو اس تھرڈ کلاس میں سفر کرتے

اپنے بادشاہ نہ ہو سکنے کا احساس اس وقت بھی نہایت شدت کے ساتھ ہوتا ہے جب ہم اپنے کسی عزیز کی ناگہانی علالت کا حال سن کر حد درجہ بدحواسی کے ساتھ بائیسکل پر بھاگے ہوئے جا رہے ہوں اور راستہ میں کانسٹبل ہم کو روک کر نہایت بے محل طریقہ پر ہمارا نام ولدیت اور پتہ دریافت کرنا شروع کر دے اور اس کے بعد بائیسکل کی ولدیت یعنی نمبر بھی ہم سے پوچھے کانسٹبل کے اس طرز عمل کو قانونی زبان میں چالان اور غیر قانونی زبان میں بد اخلاقی کہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہم کو بائیسکل میں لیمپ لگانا چاہیے۔ اور اگر ہم بغیر لیمپ کے دیکھے جائیں تو کانسٹبل کا فرض ہے کہ وہ ہمارا نمبر اور بائیسکل کی ولدیت نوٹ کرے اور چالان کر دے۔ مگر اس قسم کے مواقع پر اکثر قدرتی طور پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے۔ کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو یہ برا وقت دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ اول تو بادشاہ ہونے کی صورت میں ہم کو اسی کی ضرورت نہ ہوتی کہ ہم اپنے کسی بیمار عزیز کی عیادت کو جائیں۔ بلکہ تمام بیمار عزیز خود اپنی علالت کو بھول کر ہماری مزاج پرسی کو آیا کرتے۔ لیکن فرض کر لیجئے کہ ہم کو جانا بھی پڑتا تو ہم اس شان سے جاتے کہ ہمارے لئے تمام راستہ کی سڑکیں پہلے سے بند ہوتیں۔ اور ان پر پہرہ ہوتا۔ ہماری سواری نکلنے سے قبل ان تمام پہرہ والوں کا دم نکلتا رہتا اور جس وقت ہمارا شاہی موٹر سنسناتا ہوا نکل جاتا۔ اس وقت سب کی جان میں جان آتی۔ خیر یہ تمام باتیں تو عام طور پر

بادشاہوں کے لئے ہوا ہی کرتی ہیں۔ لیکن اگر ہم بادشاہ ہوتے تو ہمارا انتظام ہی دوسرا ہوتا۔ مثلاً ہماری سواری کی شان یہ ہوتی کہ جس سڑک سے ہم گزرنے والے ہوتے۔ اس پر تمام دن کیوڑا اور گلاب چھڑکا جاتا۔ اس کے بعد تمام سڑک پر سچے ستارے اور سچے موتی بچھا دیئے جاتے۔ اور زمین پر تاروں بھری رات کا گمان ہوتا۔ تمام راستہ میں دو رویہ بیلہ چمبیلی اور موتیے کے گجروں کی زنجیریں کھینچ دی جاتیں اور راستہ میں جا بجا خوشبودار پھولوں کے متعدد پھاٹک بنائے جاتے تماشائیوں کو سواری دیکھنے کی عام اجازت ہوتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ موسم کے اعتبار سے سرکاری طور پر مقرر کردہ لباس میں صف بصف دو رویہ کھڑے ہوں۔ اور ان میں کوئی بدصورت مرد یا عورت ہرگز نہ ہوتا کہ جہاں پناہ کی نظر خسروانہ مجروح نہ ہونے پائے البتہ کبھی کبھی جہاں پناہ یعنی ہم اگر کوئی تفریحی پروگرام بناتے تو اس میں رعایا کو دلچسپی لینے کا یقیناً حق دیتے مثلاً قصر شاہی سے یہ اعلان کر دیا جاتا کہ آج جہاں پناہ اور ملکہ معظمہ میں لباس تبدیل ہو گیا ہے چنانچہ حضور خداوند نعمت ملکہ معظمہ کے لباس میں ہوں گے۔ اور ملکہ معظمہ جہاں پناہ کے لباس میں لہذا رعایا کو حکم دیا جاتا ہے کہ تمام مرد عورتوں کے لباس میں اور تمام عورتیں مردوں کے لباس میں ٹھیک پانچ بجے قصر شاہی کے سامنے جمع ہوں اور اپنے بادشاہ کی دلچسپی میں حصہ لیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ پروگرام کس قدر دلچسپ ہوتا۔ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ صرف بادشاہ ہی کے لئے دلچسپ نہ ہوتا۔ بلکہ رعایا بھی اس دلچسپی میں برابر کی حصہ دار ہوتی ہماری فطرت سے یہ بات یقیناً بعید تھی۔ کہ ہم بادشاہ ہوتے تو سنجیدہ بنے ہوئے بس تخت پر بیٹھے رہتے۔ بلکہ ہم تو دن رات اسی فکر میں رہتے کہ اب کیا کیا جائے

اور کس صورت سے اپنے لمحات کو دلچسپ بنایا جائے مثلاً کبھی فرمان شاہی یہ نافذ کر دیا جاتا کہ دربارِ عام میں تمام درباری اپنے ہمراہ ایک ایک بندر لائیں مگر واضح رہے کہ ان بندروں کی وجہ سے کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ جو آدابِ دربار کے خلاف ہو اور ہر درباری باوجود ان بندروں کے آدابِ شاہی اور اپنی سنجیدگی کا پورا خیال رکھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو کسی درباری کی مجال ہو نہیں سکتی کہ وہ شاہی فرمان کی تعمیل نہ کرے لیکن اس فرمان کی تعمیل میں جسقدر مشکل ہو سکتی ہے اس کو وہی حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں جن کی نظر سے کوئی سنجیدہ انسان اور کوئی غیر سنجیدہ بندر گذرا ہے اوّل تو بندر کو اپنے ساتھ رکھنا ہی کمال ہے اور بڑے بڑے بہادر اس قسم کی جسارت نہیں کر سکتے لیکن جب بندر کو ساتھ رکھنا اس طرح موت اور زندگی کا سوال بنجائے سنجیدہ سے سنجیدہ انسان کے لیئے دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھ سکے اول تو وہ خود ہی نہایت مضحک ہو کر رہ جائے گا دوسرے اس کو سنجیدہ بننے کی کوششیں نہایت مضحک بنا دیں گی۔ بہر حال اس فرمان کو نافذ کرنے کے بعد ہم ایسا تماشہ دیکھتے جو لاکھوں روپیہ صرف کر کے بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ہمارا ایک سے ایک قابل وزیر ایک سے ایک خوفناک صورت کا فوجی افسر اور ایک سے ایک عالی مرتبہ رئیس دربار میں اپنے اپنے بندروں کے ساتھ جب داخل ہوتا۔ تو ہمارے لئے ہنسی کا روکنا دشوار ہو جاتا پھر لطف یہ ہوتا کہ وہ بندر اپنے اپنے مالک کی جو گت بناتے وہ بھی قابل دید ہوتی۔ اور ایک درباری کا بندر جب دوسرے درباری پر یا اس کے بندر پر حملہ کرتا وہ منظر ہمارے عہد حکومت کی تاریخ میں زرّیں حروف سے لکھنے والا ہوتا۔ اور اس دربار کو مورخ کبھی نظر انداز نہ کر سکتا۔ مختصر یہ کہ

ہمارے دربار میں آئے دن اس قسم کے تماشے ہوتے رہتے۔ اور یہ معلوم ہوتا کہ واقعی شاہی دربار ہے یہ نہیں کہ بس دربار میں ہر وقت یہی بحث ہو رہی ہے کہ رعایا کو کس طرح فائدہ پہونچایا جائے اور رعایا کی تکلیف کو کس طرح دور کیا جائے۔ یہ کام دراصل بادشاہ کا نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکے لئے جب بادشاہ نے الگ الگ محکمے کھول دیئے ہیں تو خود بادشاہ کو ان معاملات میں اپنا دماغ پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے کوئی غیر ملک اگر حملہ کر رہا ہے تو اس کو محکمۂ جنگ جانے بادشاہ سے کیا مطلب رعایا کو کوئی تکلیف ہے تو بادشاہ سے کیا ان شکایات کو سننے اور رفع کرنے کے لئے بادشاہ نے حاکم مقرر کر دیئے ہیں وہ خود ہی سب کریں گے۔ بادشاہ تو صرف اس لئے ہوتا ہے کہ بادشاہی کرے اور بادشاہی ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ انسان مزے کرے۔ لہذا ہم بھی مزے کرتے اور جی کھول کر مزے کرتے اور ایک خاص محکمہ محض اس لئے ہوتا کہ وہ بادشاہ کے لئے لطف زندگی حاصل کرنے کی نئی نئی صورتیں ایجاد کرتا رہے۔ البتہ اگر ہم کو کبھی اسمیں دلچسپی ہوتی کہ ہم کبھی تفریحاً حکومت کے معاملات کو بھی دیکھ لیں تو دوسری بات ہے لیکن ہم اس بات کے پابند نہ ہوتے اور واقعی بادشاہ پر پابندی کیسی ہمارے لئے تو دن اور رات کی پابندی بھی ناممکن ہوتی بلکہ اگر ہم دن کو سونا چاہتے تو رات کا ماحول پیدا کر دیا جاتا۔ اور رات کو جاگنا چاہتے تو وہی دن بنا دی جاتی۔ ہم بادشاہ اس لئے ہوتے کہ جدھر ہماری نظر اٹھ جائے بڑے بڑے گردن فرازوں کی گردنیں جھکی ہوئی ملیں۔ ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اگر کبھی کوئی کانسٹبل کسی داروغہ جی کے دھوکے میں غلطی سے سلام کر لیتا ہے تو اس غلطی کو سمجھتے ہوئے بھی خون میں ایک گردش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ایک روحانی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ پھر بھلا جب کانسٹبل تو

کانسٹیبل بڑے بڑے تھانہ دار اور کوتوال بلکہ بڑے بڑے جرنیل اور کرنل اپنی سانسوں تک روک کر ہم کو سلامی دیتے اور بت بنکر کھڑے ہو جاتے تو ہماری خوشی کا کیا حال ہوتا۔ اور ہماری صحت کس قدر ترقی کرتی۔ خیر یہ تمام باتیں تو بہت بلند ہیں ہم تو در اصل اپنی موجودہ حالت کو دیکھ کر اگر اپنے بادشاہ ہونے کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہماری خواہشیں ان تمام باتوں سے ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ اور ہم گھنٹوں یہی سوچتے رہتے ہیں۔ کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو روزانہ ایک نیا سوٹ پہنتے اور اعلیٰ درجہ کے ریشمی رومال عطر میں بسا کر جیب میں رکھتے۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو کبھی کسی سے کچھ قرض نہ لیتے اور اگر لیتے تو اس سے قبل کہ وہ تقاضہ کرے۔ ہم فوراً اس کا روپیہ واپس کر دیتے اور جس طرح تقاضہ کرنیوالوں سے اب ناک میں دم ہے اس وقت نہ ہوتا۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو ایک مرتبہ کشمیر کی سیر ضرور کرتے اور عام طور پر گرمیوں میں خس کی ٹٹیوں میں رہتے اور لو کے تھپیڑوں سے بچ جاتے۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو آرام کرسی پر لیٹ کر اپنے مضامین بولا کرتے اور ایک منشی ان کو لکھا کرتا بجائے اس کے کہ ہم خود لکھتے ہیں اور آنکھیں پھوڑتے ہیں۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو ہماری تمام کتابوں کے نہایت عمدہ عمدہ اڈیشن چھپا کرتے اور ہر اڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتا ممکن ہے ان میں سے بہت سی باتیں ایسی ہوں جس کا تعلق بادشاہوں سے نہ ہوتا ہو مگر ہم تو بس انہی باتوں کی حد تک بادشاہ ہونا چاہتے تھے اس سے زیادہ ہمارا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ رہ گئی سلطنت وہ ہم سے اسی طرح غیر متعلق رہتی جس طرح اب ہے۔

وکیل

ہندوستان میں جیسی اچھی پیداوار وکیلوں کی ہو رہی ہے۔ اگر اتنا ہی غلّہ پیدا ہوتا تو کوئی کبھی فاقے نہ کرتا مگر مصیبت تو یہ ہے۔ کہ غلّہ پیدا ہوتا ہے کم اور وکیلوں کی فصل ہوتی ہے اچھی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہی سب غلّہ کھا جاتے ہیں۔ اور باقی سب کے لیئے فاقے چھوڑ دیتے ہیں۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ بھوکے ہندوستانی سوائے آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے سے روٹی چھیننے کے اور کر ہی کیا سکتے ہیں اسی چھینا جھپٹی اور لڑائی دنگے میں مقدمے تیار ہوتے ہیں۔ اور ان مقدموں میں پھر ضرورت پڑتی ہے ان ہی وکیلوں کی جو ہر سال کھیتوں کے بجائے کالجوں میں غلّہ کی جگہ پیدا ہوتے ہیں ———

ضرورت اس کی تھی کہ مقدموں کی تعداد کے حساب سے وکیل ہوا کرتے۔ مگر وکیلوں کی تو یہ کثرت ہے کہ اگر ایک ایک مقدمہ میں ایک ایک ہزار وکیل لگا دیئے جائیں تو بھی وکیلوں کی ایک بہت بڑی جماعت ایسی باقی رہ جائے گی جو مقدمے نہ ملنے کی شکایت کرتی رہے یہی وجہ ہے کہ نوکری نہ ملنے کی وجہ سے بہت سے گریجویٹ گھبرا کر وکیل تو بن جاتے ہیں مگر وکیل بننے کے بعد جب مقدمے بھی نہیں ملتے تو پھر گھبرا کر نوکری کرنے لگتے ہیں۔ اگر غور کیجئے تو اس وقت وکیلوں کی

بہت سی قسمیں آپ کو ملیں گی۔ ایک قسم تو ان وکیلوں کی ہے۔ جن کی وکالت چل رہی ہے ایک قسم وہ ہے کہ وکیل صاحب خود چل رہے ہیں مگر وکالت نہیں چلتی۔ ایک تیسری قسم ان وکیلوں کی ہے بجز نہ خود چلتے ہیں نہ وکالت چلتی ہے۔ بلکہ دونوں سائن بورڈ بنے ہوئے دروازہ پر لٹکے رہتے ہیں۔ اور چوتھی قسم ان وکیلوں کی ہے جو ہیں تو وکیل ضرور مگر وکالت سے گھبرا کر کسی اسکول میں ماسٹری کر رہے ہیں یا کسی دفتر میں کلرکی فرما رہے ہیں یا کسی رئیس کے یہاں نوکر ہیں یا اپنی سسرال میں رہتے ہیں یا فقیری لے بیٹھے ہیں یا محض شاعر بنے ہیں یا کوئی اخبار نکال کر ایڈیٹر ہو گئے ہیں یا کسی فلم کمپنی میں ایکٹر ہیں یا ریلوے میں ٹکٹ کلکٹر ہیں۔ یا ابھی تک گھر میں بیٹھے ہوئے یہ غور کر رہے ہیں۔ کہ اچکا پہننے کی بجائے کھونٹی پر لٹکانا مناسب ہوگا۔ یا شادی ایجنسی کھولنے میں زیادہ فائدہ ہے۔ بہرحال وکالت کا ان کے دماغ میں کوئی خیال نہیں ہوتا۔ اور نہ بھول کر بھی وہ کبھی اپنے وکیل ہونے کے متعلق غور کرتے ہیں۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ وکالت آخر کہاں تک چلے اور کس کس کی چلے یقین جانیے کہ اگر ہندوستان بھر کے لوگ ایک دوسرے سے سر پھٹول میں مصروف ہو جائیں اور ہندوستان کی تمام آبادی کو سوائے اس کے اور کوئی کام ہی نہ رہ جائے۔ کہ وہ بس فوجداری کیا کرے۔ تو ان وکیلوں کی شاید پوری پڑے۔ مگر قصہ تو یہ ہے کہ ہر سال ہندوستان کی آبادی جتنی نہیں بڑھتی اتنے وکیل بڑھ جاتے ہیں۔ اور اگر یہی رفتار ہے تو وہ دن قریب ہے جب ہر موکل خود وکیل بھی ہوا کرے گا اور وکیل موکل بھی ہوگا۔ یعنی اس ملک میں سوائے وکیلوں کے اور کوئی نظر ہی نہ آئیگا مالک وکیل نوکر وکیل۔ میاں وکیل۔ بیوی وکیل۔ باپ وکیل۔ تاجر وکیل۔ گاہک وکیل

مجرم وکیل منصف وکیل. ملزم وکیل. گواہ وکیل چوری وکیل. مختصر یہ کہ ادھر وکیل ادھر وکیل. اتر وکیل. دکھن وکیل. پورب وکیل پچھم وکیل. گویا کہ وکیلوں کا ایک سیلاب ہوگا جس میں یہ ہندوستان بہ جائے گا۔ اور تاریخوں میں ہندوستان کا صرف اسی قدر ذکر باقی رہ جائے گا۔ کہ یہ ایشیا کا ایک ملک تھا کہ جس میں وکیل پیدا ہوتے تھے۔ اور آخر ان ہی وکیلوں کی کثرت نے اس ملک کو ڈبو دیا۔ اب بھی بحر ہند میں اکثر وکیلوں کے گون اور وکالت نامے تیرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اور غوطہ خوروں نے مقدمات کی مسلیں بھی برآمد کی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وکیلوں کی اس دن دونی رات چوگنی ترقی کے بعد وکیل بیچارے آخر کریں گے کیا۔ آج ہی یہ حال ہے کہ مقدموں کے لئے وکیل تو جس تعداد میں جس سائز جس ڈیزائن کے کہئے ڈھیر کر دیئے جائیں مگر وکیلوں کو آنکھ میں لگانے کے لئے دوا کے طور پر بھی مقدمے نہیں ملتے اور خدا جانے وہ بیچارے کیونکر وکیل بنکر زندہ رہتے اور اپنی ظاہری شان کو قائم رکھتے ہیں۔ مگر یقین جانئے کہ جو زمانہ کل آرہا ہے وہ آج سے بھی زیادہ ان وکیلوں کے لئے سخت ہے اس لئے کہ ہندوستانی روز بروز مہذب ہو رہا ہے اور سمجھدار ہندوستانی لڑائی جھگڑا چھوڑتے جاتے ہیں مگر وکیل ہیں کہ بنتے ہی آتے ہیں۔ جو وکیل پہلے سے بنے ہوتے ہیں ان کا تو حال یہ ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ پھر بھلا اس نئی درآمد کی کھپت کہاں ہو سکتی ہے یہ مذاق نہیں ہے بلکہ وکیلوں کو واقعی اپنے متعلق ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہے۔ کہ وہ کیا کریں گے اگر ہمارا یہ خیال غلط بھی ہے کہ ہندوستان مہذب ہو رہا ہے۔ اور لڑائی جھگڑے کو لوگ چھوڑ رہے ہیں جس کے بعد مقدمے تیار نہ ہو سکیں گے

تو بھی ذرا غور تو کیجیے کہ ہر سال وکیلوں کی جو فوج ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں سے نکلتی ہے اس کے لئے نئے نئے مقدمے کہاں سے لائے جائیں گے۔ اور اگر اسی حساب سے ہندوستان میں جرائم کی رفتار بڑھتی گئی۔ اور مقدموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا تو اس کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ کہ یا تو ہندوستان ایک بہت بڑا جیل خانہ بن کر رہ جائے ورنہ سری نگر سے راس کماری تک اور کراچی سے ڈبرو گڑھ تک لمبی چوڑی کچہری ہو جائے گا۔ لیکن اس کے بعد بھی تو وکیلوں کو اپنے لئے کوئی اور راستہ ڈھونڈھنا پڑے گا۔ پھر آخر وہ ہندوستان کو جیل خانہ یا کمرۂ عدالت بنا دینے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ آخر اپنے لئے ابھی سے کوئی راستہ کیوں نہیں ڈھونڈھتے جنگلات کا محکمہ ہے اس میں جگہ ڈھونڈھتے رہیں۔ دنیا کے سمندروں میں بہت سے غیر آباد جزیرے ہیں۔ ان کو ڈھونڈھیں اور آباد کریں۔ ہمالیہ کی مہم میں اب تک سب کو ناکامی ہوئی ہے یہ لوگ بھی کوشش کریں۔ شاید کامیابی انھیں کی قسمت میں لکھی ہو —— ہندوستان کے جنگلوں میں خوفناک درندے مارے مارے پھرتے ہیں اگر ان کو سدھا لیا جائے تو وہ سرکسوں میں کام آسکتے ہیں اور سرکس والے اچھے دام دیکر ان کو خرید سکتے ہیں۔ لہذا ان درندوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کریں

شیر کو سلام کرنا سکھائیں۔ بھالو کو حقہ پینے کی تعلیم دیں۔ بندروں کو ڈانس کرائیں۔ اور اسی طرح ان جنگلی جانوروں کو سرکس کے قابل بنائیں۔ یہ بہت فائدے کا کام ہے۔ اور اس کام میں سب ہی لگ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ذرا محنت کریں۔ دنیا کے سمندروں میں آئے دن جہاز ڈوبتے رہتے ہیں۔ ایسے ایسے خزانے

ہوتے ہیں جو اگر کسی کو مل جائے تو وہ مالدار ہو جائے لہٰذا غوطہ خوری سیکھیں اور اس دولت کو حاصل کریں جو مچھلیوں اور کچھوؤں کے لئے بیکار ہے۔ مگر انسان کے کام آ سکتی ہے۔ اور انسان کو مالا مال کر سکتی ہے اسی ہندوستان میں خدا جانے زمین کے اندر کیسے کیسے خزانے ہیں کہیں سونے کی کان ہے تو کہیں مٹی کے تیل کا چشمہ۔ کہیں کوئلہ ہے تو کہیں لوہے کی کان ہے۔ اگر ویران جنگلوں میں ذرا کھدائی شروع کر دی جائے تو اگلے زمانہ کے بادشاہوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے رجواڑوں تک کے خزانے اگل مل سکتے ہیں۔ اور یہ کانیں الگ دریافت کی جا سکتی ہیں۔ دوسرے ملک کے لوگ نئی ایجادیں کرتے رہتے ہیں کہ کہیں کسی درخت کے ریشوں سے کپڑا بنا لیا تو کہیں دو تین درختوں کی جڑوں کو ملا کر کوئی کھانے کی چیز پیدا کر لی۔ آخر اس قسم کی ایجادوں کی طرف یہ لوگ کیوں نہ متوجہ ہوں کیا تعجب ہے کہ ان ہی کے دماغ میں کوئی ایسی ترکیب آ جائے جس سے کپڑے کو کھایا اور روٹی کو پہنا جا سکے۔ یا ریت کو اناج کی طرح پیٹ بھرنے کے کام میں لایا جا سکے یا آٹے کی بھوسی سے سوٹ کا کپڑا تیار ہو سکے بہرحال دماغ لڑانے کی ضرورت ہے اور جب دماغ لڑ جائے تو ہاتھ پیر چلانے کی بھی ضرورت ہو گی۔ اس لئے کہ اب خالی بیٹھے اور وکالت سے کوئی امید رکھنے سے کام نہیں چل سکتا خدا نہ کرے کہ وکیلوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی طرح مقدمے بھی بڑھتے جائیں۔ ابھی تو خیر منشی جی ایک آدھ موکل کہیں نہ کہیں سے پکڑ ہی لاتے ہیں۔ اور وکیل صاحب اونے پونے اس کا مقدمہ اس لئے لڑا دیتے ہیں۔ کہ پیٹ میں آنتیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں۔ اور گھر میں بیوی کی ناک میں دم

رکھتی ہیں۔ آخر ان سب کو کسی طرح سمجھایا جائے یا نہیں۔ لیکن اب تو وہ وقت بھی آرہا ہے۔ جب منشی جی خود بھی وکیل ہوں گے۔ اور گھر والی بھی وکیل ہونگی پھر وکیل صاحب آسانی سے یہ نہ سمجھا سکیں گے کہ مقدمہ کیوں نہیں ملتا۔ اور وکالت کیوں نہیں چلتی۔

صاحب لاکھ باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ دنیا کی ہوا ہی کچھ وکالت کے خلاف چل رہی ہے۔ ایک طرف وکیل بڑھتے جاتے ہیں۔ اور وکیل عام طور پر اچھی خاصی عمر پاتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کے ہر کل قسم کے باشندے مقدموں کا شوق چھوڑ رہے ہیں۔ اگلے زمانہ میں تو یہ ہوتا تھا کہ کسی نے کسی کو دیکھ کر زمین پر تھوک بھی دیا تو لیجئے۔ ایک لاجواب چلتا پھرتا مقدمہ تیار ہو گیا جو مہینوں چلا کرتا تھا اور دونوں طرف کے وکیلوں کو خوب خوب فیسیں ملتی تھیں لیکن اب تو یہ حال ہے کہ کسی کو سرِ راہ مار بھی دیجئے اور پھر صرف یہ کہہ دیجئے کہ معاف کیجئے گا۔ غلطی ہوئی بس وہیں پر ہاتھ مل جاتے ہیں۔ اور یہ قصہ کچہری کیا معنی تھانہ تک نہیں پہنچتا یا اچھی خاصی فوجداری کو لوگ بیچ بچاؤ کر کے ختم کرا دیتے ہیں۔ یہ در اصل وکیلوں کی حق تلفی ہے۔ اور وکیلوں کو چاہئے کہ اس کے لئے قانون بنوائیں کہ اس طرح کا نجی بیچ بچاؤ جرم قرار دیدیا جائے ورنہ تمام معاملات یوں ہی طے ہونے لگیں گے۔ اور یہ وکیل بیچارے کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ بلکہ اگر وکیل صاحبان ہماری رائے مانیں تو ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے لئے ان معاملات میں بھی حق پیدا کریں جن کا تعلق اب تک قانون یا عدالت سے نہیں ہے اس لئے کہ مقدمہ بازی تو بہت جلد کم ہو ہی جائیگی اور وکیلوں کا کام اب دوسری صورتوں ہی سے چل سکتا ہے جن میں سے چند ہم

بتائے دیتے ہیں۔ مثلاً وکیلوں کو چاہیئے کہ وہ اس بات پر زور دیں۔ کہ چونکہ شادی بیاہ بالکل قانونی چیز ہے لہذا ہر شادی کے موقع پر ایک قاضی کے علاوہ لڑکی والوں اور لڑکے والوں کی طرف سے ایک ایک سند یافتہ وکیل بھی ہوا کرے تاکہ وہ شادی کی قانونی صورتوں کو باقاعدہ بنا سکیں اور کوئی قانونی خامی باقی نہ رہے۔ اسی طرح بچہ کی پیدائش کے وقت دائی کو چاہیئے کہ وہ وکیل کے سامنے اپنا بیان دے اور اسی بیان کی روشنی میں بچہ کی وراثت طے پائے۔ طلاق اور عاق کے قصوں میں بھی وکیلوں کی موجودگی ضروری بتائی جائے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی چیزیں ہیں جن میں آئندہ وکیل اپنی وکالت کو کام میں لا سکیں گے۔ اور ان چیزوں کے لئے اگر ابھی سے کوشش نہ کی گئی تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ اور پھر وکیلوں کی جو حالت ہو گی وہ نہایت افسوسناک ہو گی۔ مگر ہم کو امید ہے کہ وکیل صاحبان یہ نوبت نہ آنے دیں گے۔ بلکہ اپنے اور اپنی آئندہ نسل کے لئے یہ انتظام کریں گے۔ کہ مقدموں کے علاوہ بھی قدم قدم پر ان کی ضرورت محسوس ہو۔ زمین وکیل صاحب خریدوائیں گے۔ جائداد وکیل صاحب بکوائیں گے۔ ریل کا ٹکٹ وکیل صاحب کے سامنے خریدا جائے گا۔ اسکول میں بچہ کا داخلہ وکیل صاحب کے ذریعہ ہوا کرے گا۔ پارسل وغیرہ ایک وکیل صاحب کے سامنے روانہ ہونگے اور دوسرے وکیل صاحب کے سامنے کھولے جائیں گے۔

میاں بیوی وکیلوں کو سامنے بٹھا کر آپس میں لڑا کریں گے۔ باپ وکیل صاحب کی موجودگی میں بچے کو سزا دے گا۔ ڈاکٹر وکیل صاحب کی موجودگی میں نسخہ لکھیں گے اور مریض وکیل صاحب کے سامنے نسخہ استعمال کرے گا۔ مرنے والا وکیل صاحب

سے مشورہ لے کر مرے گا۔ اور مرنے والے کے عزیز وکیل صاحب کی رائے سے کفن کا انتظام کریں گے۔ شاعر وکیل صاحب سے پوچھ پوچھ کر شعر کہا کریں گے اور ایڈیٹر اپنا ہر پرچہ وکیل صاحب کو دکھا کر شائع کریں گے مقرر پہلے وکیل صاحب کو تقریر سنائے گا۔ اور جلسہ میں جانے والے پہلے وکیل صاحب سے رائے لے لینگے۔ مختصر یہ کہ ان تمام باتوں میں اگر وکیلوں نے اپنی ضرورت پیدا کر لی تو خیر نہیں تو ہم بتائے دیتے ہیں۔ کہ آج نہیں تو کل وکیل صاحبان یہ غور کریں گے۔ کہ ہم کیا کریں۔ اور ہمارا کام کیا ہے۔ یہ جتنی چیزیں ہم نے بتائی ہیں ان میں وکیل صاحبان اپنی ضرورت آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ بظاہر یہ معمولی باتیں ہیں مگر بڑھتے بڑھتے یہی بات کا بتنگڑ بنکر عدالتوں اور ہائی کورٹوں سے گذر کر پریوی کونسل تک پہونچ سکتی ہیں۔ لہٰذا وکیلوں کی ان میں یقیناً ضرورت ہے یہ اور بات ہے کہ وکیل اپنی ضرورتیں خود نہ پیدا کرائیں۔

بے روزگار

ہم بیکار تو یقیناً نہیں ہیں اس لئے کہ اس مختصر سی زندگی میں جو کارنمایاں ہم نے انجام دیئے ہیں وہ بجائے خود اس کی تردید میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ ایک بیکار آدمی اسقدر کارآمد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہ ہم نے متعدد چھوٹے چھوٹے امتحانات پاس کئے یا یہ کہ صرف ایک بی، اے کے امتحان میں مسلسل اور متواتر تین سال تک فیل ہوئے اس کے بعد ہم نے ایک شادی کی پھر دو مستقل بچے پیدا کئے یہ تمام باتیں آپ کو اس بات کا یقین دلا دینے کے لئے کافی ہیں کہ ہم بیکار نہیں ہیں۔ البتہ اس بات کا نہایت صفائی کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہم بے روزگار ضرور ہیں۔ مگر اس میں دراصل ہماری کوئی خطا نہیں ہے بلکہ اگر سچ پوچھیئے تو اس میں غلطی ہے ہر اس روزگار کی جس کو حاصل کرنے کی ہم کوشش کرتے ہیں مگر وہ خود ہم سے گریزاں نظر آتا ہے۔

ہم آپ کو یاد دلانا چاہتے ہیں اور شرافت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ آپ ان تمام واقعات کو صحیح سمجھئے گا۔ کہ ہم چار سال سے مسلسل روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہیں سب سے پہلے تو ہم نے پولیس کی سب انسپکٹری کے لئے زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے اور ممبران کونسل سے لیکر وزراء تک کی سفارشیں اپنی

تائید میں لاکر کھڑی کردیں۔ مگر یہ مقدر ہی تو ہے۔ کہ جب یہ تمام کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ اور پولیس ٹریننگ اسکول میں داخلہ کا امکان پیدا ہوا تو خدا جانے کیونکر سینہ پورے چار انچ چھوٹا نکل گیا۔ اس سلسلے میں روایات ذرا مختلف ہیں ہمارے بعض احباب کا خیال یہ ہے کہ دراصل ہمارا سینہ چھوٹا نہ تھا بلکہ سینہ ناپنے کا فیتہ ہی چار انچ بڑا تھا اور خود ہمارا خیال یہ ہے کہ فیتہ بھی ٹھیک تھا اور سینہ بھی کافی چوڑا تھا مگر اس قسم کے امتحانی موقع پر ہماری ہمیشہ کی عادت ہے کہ کچھ سکڑ جاتے ہیں۔ اور یقیناً یہی واقعہ اس پیمائش کے وقت بھی پیش آیا ہوگا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو تمام سفارشیں دھری رہ گئیں۔ اور تمام کوششوں پر پانی پھر کر رہ گیا اب آپ ہی بتائیے کہ اس میں ہمارا کیا قصور تھا یقین جانیے کہ اگر سینہ کی طرف سے یہ گمان بھی ہوتا کہ عین وقت پر دھوکا دے گا تو ہم سب سے پہلے اسی کی خبر لیتے اور ورزش وغیرہ کر کے اس خامی کو ہرگز باقی نہ رہنے دیتے۔ بہرصورت اب تو پولیس کے خیال ہی کو دل سے نکال دینا پڑا۔ اور سب انسپکٹری کے بعد نظر انتخاب سب رجسٹراری پر پڑی۔

سب رجسٹراری ایک معمولی سی تنخواہ کی چھوٹی سی ملازمت ہے مگر ہم نے تو ہر سب رجسٹرار کو اسقدر مطمئن اور خوش پایا ہے کہ گویا سب رجسٹرار ہونے کے بعد حضرات وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ لہذا ہم بری طرح سب رجسٹراری پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے لئے کوئی ایسی کوشش نہ تھی جو اٹھا رکھی ہو۔ پہلے سال تو درخواست ذرا دیر میں گذری ——— لہذا دوسرے سال پر معاملہ ٹل گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گویا ہم کو ایک سال کا مزید موقع ملا کہ ہم اپنی امیدواری کے استحقاق کو

مستحکم بنائیں چنانچہ یقین جانیئے کہ ہم نے اس جگہ کے لیئے وہ کوششیں کی ہیں کہ آخر کار
ہماری درخواست قابل غور درخواستوں میں شامل کر لی گئی۔ اور اب نہ صرف
ہم کو بلکہ ہر ایک کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ ہمارا انتخاب ضرور عمل میں آئیگا۔
اور وہی ہوا بھی کہ ہم کو آخر کار انٹرویو کے لیئے طلب کیا گیا۔ اور ہم اپنے گھر سے
سب رجسٹراری کی حیثیت سے روانہ ہوئے مگر اب ذرا نحوست مآبی ملاحظہ ہو کہ
عین انٹرویو کے وقت معلوم یہ ہوا کہ ہماری عمر زیادہ ہے۔ اور زیادہ بھی کتنی صرف
ایک دن۔ ہم نے لاکھ لاکھ چاہا کہ ایک دن کو نظر انداز کر دیا جائے مگر معلوم ہوا کہ
اس ایک دن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خواہ ہم خود ہی نظر انداز کر دیئے جائیں۔ نتیجہ
یہ ہوا کہ اس ایک دن کی بزرگی نے ہم کو یہاں بھی مارا۔ اور اپنا سا منہ لے کر واپس
آ گئے ناامیدی اور دل شکستگی کا جو عالم ہم پر طاری تھا اس کی تفصیل کچھ نہ پوچھیئے مگر اس
کے باوجود آپ انصاف سے کام لے کر یہ بتائیں کہ اس میں آخر ہماری کیا خطا تھی اگر
ہمارے امکان میں ہوتا تو ایک دن کیا معنی ایک ہفتہ بعد میں پیدا ہوتے مگر قسمت
میں تو یہ گردش لکھی تھی۔ ایک ہفتہ بعد کیونکر پیدا ہوتے۔ یا پیدا ہی نہ ہوتے تو بھی
یہ ہو سکتا تھا کہ نظر انتخاب کچھ دن پہلے ہی ہو جاتا۔

سب انسپکٹری کے بعد سب رجسٹری کی کوشش میں اس غیر متوقع ناکامی نے
ہمارے تمام حوصلے پست کر دیئے اس لیئے کہ اول تو کسی قدر لغو اور مہمل طریقہ پر ناکام
ہوئے تھے دوسرے عمر متجاوز ہو چکی تھی جس کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اب سرکاری ملازمت
کا دروازہ ہم پر بند ہو چکا تھا ادھر گھر میں یہ حال کہ اس خاکسار مربی کو مربہ سمجھ کر
اہل و عیال کھائے جاتے ہیں ماشاء اللہ بھرا ہوا گھر اور کمانے والے صرف ہم

وہ بھی بے روزگار۔ اس میں شک نہیں کہ آخر ہم کیا کرتے اور ہمارے بس کی کیا بات تھی۔ مگر بیگم بھی ٹھیک کہتی تھیں کہ آخر وہ کیا کریں اور گھر کا خرچ کیونکر چلائیں۔ ہمارا یہ حال کہ صبح سے روزگار کی تلاش میں نکلتے ہیں تو شام کو واپس آتے ہیں۔ مگر بجلسہ اس طرح جس طرح گئے تھے۔ ادھر گھر والوں کا یہ حال کہ ہر ایک کی ضروریات ہم سے وابستہ ہیں۔ اور ہر ایک کی دعائیں ہمارے ساتھ مگر وقت تو ایسا پڑا ہے کہ ہر دعا بددعا ہو کر لگتی ہے اور ہر کوشش مایوسی اور ناکامی پر ختم ہوتی ہے۔

سرکاری ملازمت کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد پرائیوٹ ملازمت کی فکر پیدا ہوئی۔ اور اس سلسلہ میں خدا کا شکر ہے کہ ہم کو زیادہ دوڑ دھوپ کرنا نہ پڑی ملکہ فوراً ہی ایک تعلقہ دار صاحب کی ریاست میں منیجری کے عہدہ پر فائز ہو گئے اس میں شک نہیں کہ یہ ایک چھوٹا سا تعلقہ تھا مگر نام تو تھا ریاست کی منیجری کا۔ لہذا ہم بیحد خوش تھے کہ اس ملازمت پر قدم جما کر ترقی کی منزلیں طے کریں گے۔ اور تعلقہ دار صاحب کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ کہ قابل منیجر بھی کیا چیز ہوتا ہے ان کی ریاست بہت زیادہ مقروض تھی۔ اس حد تک مقروض کہ خود ہم کو یہ اندیشہ تھا کہ شاید تنخواہ ماری جائے مگر اس ملازمت کو غنیمت اس لئے سمجھ رہے تھے کہ بے روزگاری کے طعنوں سے نجات مل جائے گی۔ اور اگر تنخواہ نہ بھی ملی تو واجب الادا کہلائے گی۔ اس کے علاوہ کچھ نہ کچھ تو ملتا ہی رہے گا۔ جو اس موجودہ کچھ بھی نہیں سے بہر حال بہتر ہو گا۔ یقین جانئے کہ جس وقت ہم نے اپنی ملازمت کا مژدہ گھر والوں کو سنایا ہے۔ سب کی باچھیں کھل گئیں۔

کسی نے شکرانہ کی نماز ادا کی تو کسی نے ہماری بلائیں لینا اور ہم کو دعائیں دینا شروع کردیں گویا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا اور واقعی خوشی کا مقام بھی تھا۔ کہ تین سال کی مسلسل امیدواری اور رہر امیدواری میں ناکامی کے بعد یہ صورت نظر آئی تھی چنانچہ دوسرے دن جب ہم اپنے عہدہ کا چارج لینے کیلئے چلے تو پانوں کی ڈبیہ بھی تیار تھی۔ نیا بٹوا بھی بھر دیا گیا تھا۔ اور بالکل ایسے انتظامات تھے کہ گویا ہم لام پر جا رہے ہیں۔ امام ضامن کی ضامنی۔ مبارک سلامت کے نعروں اور دہی مچھلی کے شگون کے ساتھ ہم گھر سے روانہ ہوئے راجہ صاحب کی کوٹھی کی طرف اب ذرا ملاحظہ ہو۔ ہماری سبز قدمی کہ راجہ صاحب کی کوٹھی میں جو پہنچے تو معلوم ہوا کہ کسی ماتم کدہ میں داخل ہوئے ہیں۔ ہر طرف غمناک سناٹا در و دیوار پر یاس برس رہی ہے۔ ادھر ایک گردن لٹکائے ہوئے تصویر حسرت نظر آ رہا ہے۔ ہم نے اپنے دل میں کہا الٰہی خیر۔ معلوم نہیں یہاں کیا سانحہ ہوا ہے اب کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ خدا جانے کیا خبر وحشت اثر سننے میں آئے آخر کار پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے راجہ صاحب کی بیٹھک میں جو پہنچے تو وہ بھی داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی خاموش شمع کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ خیر اس طرف سے تو اطمینان ہو گیا کہ خود راجہ صاحب بفضلہ اچھے ہیں۔ مگر سانحہ یقیناً ایسا سخت تھا کہ خود راجہ صاحب پر بھی اس کا بعد اثر معلوم ہوتا تھا۔ خود راجہ صاحب شدت غم سے گم سم نظر آ رہے تھے۔ آخر کار ہم نے خود ہی اپنے ایک ہم نشین سے چپکے سے پوچھا "آخر واقعہ کیا ہے؟"

ہمنشین نے چپکے سے جواب دیا "علاقہ کورٹ ہو گیا"

ہم نے بے ساختگی کے ساتھ کہا "کورٹ"

ہمنشین نے کہا: "ہاں ابھی تار آیا ہے۔؟"

یقین جانیے کہ دل کی حرکت نے بند ہونے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ فوراً یہ ضرب المثل ذہن میں آگئی کہ "جہاں جائے بھوکا وہاں پڑے سوکھا" راجہ صاحب کو یقیناً اپنے علاقہ کے کورٹ ہونے کا بس اسی قدر صدمہ ہوگا جس قدر اس وقت ہم کو اپنی اس ملی ملائی ملازمت کے اس طرح جانے کا صدمہ تھا۔ دل بیٹھا جاتا تھا اور آنکھیں رونے کے لیے بیقرار تھیں پھر بھی ایک آدھ سرد آہ اگر سرزد ہوگئی ہو تو کوئی تعجب نہیں اور اس کو راجہ صاحب کی ہمدردی میں شامل کر لیا گیا ہوگا۔

ہم تھوڑی دیر راجہ صاحب کے پاس بیٹھے رہے۔ اس کے بعد جب راجہ صاحب تخلیہ میں تشریف لے گئے تو ہم نے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کر دیا۔ کہ آخر اب ہم کہاں جائیں۔ میز پر رکھا ہوا اخبار یوں ہی اٹھا لیا مگر یہ بھی عجیب اتفاق کہ اس میں سب سے پہلے "ضرورت ہے" کے عنوان پر نظر پڑی۔ حالانکہ وہ اشتہار ہمارے متعلق نہ تھا۔ بلکہ مشتہر کو ضرورت تھی ایک ایسی لڑکی کی جو خوش جمیل۔ سگھڑ اور شریف خاندان ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اشتہار ہمارے کام کا نہ تھا مگر اس کے نیچے ہی ایک دوسرا اشتہار تھا جس میں ضرورت تھی ایک ایسے تجربہ کار اسسٹنٹ ایڈیٹر کی جو ترجمہ میں مہارت رکھتا ہو۔ اور جس کو قلم برداشتہ سیاسی شذرات لکھنے کی مشق ہو۔ یہ اشتہار ہمارے شہر ہی کے ایک روزنامہ کی طرف سے دیا گیا تھا

لہٰذا ہم اخبار لئے ہوئے راجہ صاحب کی کوٹھی سے سیدھے اس اخبار کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس لئے کہ دراصل اس وقت گھر جانا ہمارے لئے دشوار بھی تھا اور گھر والوں کے لئے خطرناک بھی کہ جس وقت ہم اپنی ناکامی کا روح فرسا واقعہ سنائیں گے اس وقت خدا جانے کس کس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے اور شدتِ غم سے خدا جانے کس کا کیا حال ہو۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ ہم گھر پر جا کر یہ کہہ دیں کہ راجہ صاحب کی ریاست کے منیجر نہیں بلکہ ایک اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے ہیں مگر ایک سرے سے کچھ نہیں کی خبر سننے کا گھر والا اب کوئی بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بہر صورت ہم جس وقت اخبار کے دفتر میں پہونچے ہیں۔ وہاں نہایت انہماک کے ساتھ اخبار کی ترتیب کا کام جاری تھا۔ ہم نے چیف ایڈیٹر صاحب کو اطلاع کرائی اور فوراً ہم کو باریابی کی اجازت مل گئی۔ یہ حضرت عمر خیام کے قریبی بزرگوں میں سے معلوم ہوتے تھے بالکل سفید داڑھی۔ موٹے موٹے بالوں کی عینک لگائے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ گویا آپ فادر کرسمس کے بڑے بھائی ہیں۔ اور حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہونا بھول گئے تھے۔ لہٰذا اسی کمرے میں بیٹھے رہ گئے ہیں۔ ہم کو دیکھتے ہی آپ نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر فرمایا "کیسے زحمت فرمائی"!

ہم دراصل اس وقت بیحد مرعوب ہو رہے تھے۔ لہٰذا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ البتہ اخبار اٹھا کر ان کو دکھا دیا۔ اور صرف یہ کہہ سکے کہ "یہ آپ کا اخبار ہے آج ہی کی تاریخ کا۔"

ایڈیٹر صاحب نے کہا: "جی ہاں اس سے آپ کا مقصد"؟

اب ہم خود سمجھ گئے کہ ہم نے کس قدر نامعقول بات کہی تھی۔ لہٰذا ذرا معقولیت کے ساتھ کہا: "اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے!"

ایڈیٹر صاحب نے اپنی عینک سے اپنی نگاہیں ہماری طرف جماتے ہوئے کہا: "آپ اس جگہ امیدوار ہیں؟"

ہم نے کہا: "جی ہاں!"

ایڈیٹر صاحب نے ہم کو گھورتے ہوئے کہا: "آپ ترجمہ کر سکتے ہیں؟"

ہم نے کہا: "جی ہاں!"

ایڈیٹر صاحب نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کا ایک تار دیتے ہوئے کہا۔ "اس کا ترجمہ فوراً کر دیجئے!"

ہم نے اس تار کو لے کر دیکھا۔ اور پھر غور سے دیکھا مگر صرف اسی قدر سمجھ سکے کہ انگریزی رسم الخط میں خدا جانے کون سی زبان لکھی ہوئی ہے۔ تاہم قلم لے کر ترجمہ کی کوشش شروع کر دی۔ اور عین اس وقت جبکہ ایڈیٹر صاحب نے اپنی گرجدار آواز میں کہا کہ "کر چکے آپ ترجمہ"!

ہم نے نصف سے زیادہ ترجمہ ایڈیٹر صاحب کے حوالہ کر دیا۔ ایڈیٹر صاحب نے ترجمہ کی شاید ایک ہی سطر پڑھی ہوگی۔ کہ بڑی زور سے ڈانٹ کر پوچھا: "یہ آپ نے بھرو بھرو۔ یار بار کیا لکھا ہے!"

ہم نے تار دکھاتے ہوئے کہا: "یہ میں خود نہیں سمجھا کہ اس میں جا بجا۔ "اسٹاپ اسٹاپ۔ کیا لکھا ہوا ہے!"

ایڈیٹر صاحب نے مسکرا کر ترجمہ رکھتے ہوئے کہا: "آپ نے کبھی کسی اخبار

میں کام نہیں کیا ہے"!

ہم نے کہا "جی نہیں"!

ایڈیٹر صاحب نے فیصلہ کن انداز سے کہا "تو پھر آپ کے لئے صرف ایک صورت یہ ہے کہ آپ امیدوار کی حیثیت سے بلا تنخواہ کام سیکھیں۔ اگر آپ کارآمد ہو سکے اور جگہ خالی رہی تو آپ کو مل جائے گی"!

ایڈیٹر صاحب کے اس جواب پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ بشرطیکہ غور کرنے کی مہلت بھی دی جاتی۔ بہر صورت اس وقت ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ رضامند ہو جائیں۔ چنانچہ ہم کو امیدوار مترجم کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر ہم گھر پر جا کر کیا کہیں۔ اخبار کے دفتر میں ملازمت تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا مگر یہ سمجھانا کوئی آسان بات نہ تھی۔ کہ فی الحال تنخواہ کچھ نہ ملے گی۔ اس لئے کہ گھر والوں کو تو ضرورت تنخواہ کی تھی ملازمت کی نہیں وہ اس کو تو گوارا کر سکتے تھے کہ فی الحال تنخواہ ملے خواہ ملازمت بعد میں ملتی رہے مگر یہ صورت انکو منظور نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ ملازمت مل گئی ہے۔ مگر فی الحال تنخواہ نہ ملے گی۔ بہر صورت گھر جانے کا ایک بہانہ مل گیا تھا۔ لہذا ہم گھر پہونچے اور قبل اسکے کہ راجہ صاحب کے یہاں کی ناکامی کا افسانہ سنائیں اخبار کی ملازمت کا حال سب سے پہلے سنایا اس کے بعد راجہ صاحب کے یہاں کی ناکامی کا قصہ گوش گذار کیا۔ اور سب کے آخر میں یہ بھی دبی زبان سے کہدیا کہ ابھی تنخواہ طے نہیں ہوئی ہے۔ کام دیکھنے کے بعد طے ہو گی۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ یہ سنتے ہی سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ اور سب کے چہروں پر مردنی چھا گئی بلکہ مردنی چھائے ہوئے

سوال تو یہ ہے کہ آخر ہم کیا کریں زیادہ سے زیادہ یہی ناکہ روزنہ اخبار کے دفتر میں
توجہ کرنے جاتے ہیں۔ اور وہاں وقت نکال کر تمام اخبارات میں "ضرورت ہے"
کے تمام اشتہارات بلاناغہ پڑھ جاتے ہیں۔ اور ہر جگہ کے لئے ایک ایک درخواست
روانہ کر دیتے ہیں اس کے بعد بھی نوکری نہ ملے تو یہ ہمارا مقدر

سفر

(میر صاحب کے یہاں ایک ہنگامہ برپا ہے کوئی لوٹے کے لئے چیخ رہا ہے تو کوئی سلیپر کے لئے کسی کو بستر بند کی فکر ہے تو کوئی ناشتہ دان مانگ رہا ہے اور خود میر صاحب اپنے مصاحب نما احباب میں بیٹھے ہوئے اپنے اس سفر کے متعلق تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔)

میر صاحب: "اماں تم ہی بتاؤ مرزا صاحب کہ اس ریل کے سفر میں کچھ نصیب دشمناں جان جوکھم تو نہیں ہے؟"

مرزا صاحب: "آپ کی بھی واللہ ہے کہ کیا باتیں ہیں یعنی میں کہہ تو رہا ہوں کہ اسی ریل کے سفر میں سر کے بال سفید کر لئے ہیں پھر آپ کا یہ سفر تو ذرا ایک کا ہے دو اسٹیشن بیچ ہیں تیسرے پہ اصل خیر سے آپ اتر پڑیں گے۔"

میر صاحب۔ انشاء اللہ مگر بھائی بات یہ ہے کہ پہلا اتفاق ہے اسی لئے بھی گھبراتا ہے۔ اماں تم بھی چلنا ساتھ تم کو ذرا اس سفر کا تجربہ ہے۔ اور میں بالکل نیا آدمی تمہارے سر عزیز کی قسم کلیجہ ہاتھوں اچھلتا ہے۔"

مرزا صاحب۔ اگر آپ کہتے ہیں تو مجھ کو کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مگر آپ نے واللہ ہے کہ کمال کر دیا اس زمانہ میں آپ کے ایسے بہت کم نکلیں گے جو ریل کے سفر سے

ناواقف ہوں!"

میر صاحب۔ بھئی یقین مانو کہ میں خاندانی وضعداری کے خلاف یہ بات کر رہا ہوں۔ اللہ جنت نصیب کرے (ابّاجان مرحوم تو اس محلہ کے باہر کبھی نہ نکلے تھے اور خدا بخشے دادا جان مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کبھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے ایک میں ہوں کہ دیس چھوڑ کر پردیس کی ٹھانی ہے!"

مرزا صاحب:۔ لیجئے لیجئے شیخ صاحب بھی تشریف لے آئے۔"

شیخ صاحب:۔ آداب بجا لاتا ہوں حضور والا!"

میر صاحب۔ تسلیمات عرض ہے بھائی صاحب خوب تشریف لائے!"

شیخ صاحب۔ جی ہاں ابھی سنا تھا کہ سواری کہیں سیر و سیاحت کو جا رہی ہے!"

میر صاحب۔ لو اور سنو یہ سیر و سیاحت ہے کہ آدمی دیس چھوڑ کر پردیس کا ہو جائے مگر کیا کروں مجبور ہوں جائداد کا مقدمہ ہے نہیں جاتا ہوں تو خاندانی جائداد جاتی ہے ورنہ بھائی تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندان کو سفر سے کیا علاقہ ہے!"

شیخ صاحب۔ بجا فرماتے ہیں جناب بیشک تشریف لے جانا ضروری ہے!"

مرزا صاحب۔ بھائی صاحب ہمارے میر صاحب ریل کے سفر سے سخت پریشان ہیں آپ ہی کچھ سمجھائیے!"

میر صاحب۔ میں پریشان نہیں ہوں البتہ پہلا اتفاق ہے اور سواری بھی وہ ایسی جس کے نہ لگام نہ جس پر چابک کا زور اور سنا ہے کہ پھر بھی وہ ہوا سے باتیں کرتی ہے!"

شیخ صاحب ۔ اے جناب اس میں ذرا بھی تشویش کی بات نہیں میں خود برابر سفر کرتا رہتا ہوں نہایت آرام کی سواری ہے "!

مرزا صاحب ۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا مگر آپ کو اطمینان نہیں ہوتا اور مجھکو بھی ساتھ لئے جاتے ہیں "!

میر صاحب ۔ تو کیا شیخ صاحب قبلہ کو میں چھوڑ دوں گا "!

شیخ صاحب ۔ نہیں حضرت میں تو معافی چاہوں گا آج کل گھر میں ذرا علیل ہیں اور خود مجھکو بھی صبح چھینکیں آرہی تھیں "!

میر صاحب ؛۔ یہ تو واللہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم پردیس کو سدھاریں ہمارے احباب دیس ہی رہیں آپ کو تو میں چھوڑ ہی نہیں سکتا "!

مرزا صاحب ۔ بھائی صاحب آپ نے تو کبھی میر صاحب قبلہ کی کسی بات میں کوئی عذر نہیں کیا ہے "!

شیخ صاحب ؛۔ میں اور عذر کروں ۔ استغفراللہ میں تو صرف اجازت چاہتا تھا وہ بھی اگر منظور نہیں ہے تو جو حکم ہو بندہ حاضر ہے "!

میر صاحب ۔ بس تو بھائی صاحب آپ فوراً گھر تشریف لے جاکر الٹے پیروں واپس آجائیے ۔ اس لئے کہ اب وقت بہت کم ہے "!

شیخ صاحب ۔ گاڑی تو چار بجے جاتی ہے اور ابھی ایک ہی تو بجا ہے "!

میر صاحب ۔ یہ درست ہے مگر کیا اعتبار اس بے لگام گھوڑے کی گاڑی کا اور جو پہلے ہی چل دے "!

مرزا صاحب ۔ جی نہیں ایسا نہیں ہو سکتا مگر ہاں احتیاط اچھی چیز ہے

اگر گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے اسٹیشن پہونچ جائیں تو اچھا ہے“

شیخ صاحب۔ ”تو میں اجازت چاہتا ہوں ابھی حاضر ہوا“

میر صاحب۔ ”بسم اللہ۔ مگر میں چشم براہ ہوں“

شیخ صاحب۔ (جاتے ہوئے) ”میں ابھی حاضر ہوا بس گیا اور آیا۔“

(دولت (ملازم) آتا ہے اور سامان کے متعلق میر صاحب سے دریافت کرتا ہے)

دولت۔ ”سرکار بستر میں تکئے، تکیئیاں توشک۔ چادر۔ شال، پلنگ پوش رکھ دیا ہے اور کچھ تو نہ رکھا جائے گا“

میر صاحب:۔ ”اور لحاف ——“

مرزا صاحب۔ ”ایں یعنی اس گرمی میں لحاف بھی لے جائیے گا“

میر صاحب۔ ”بھائی پردیس کا معاملہ ہے معلوم نہیں وہاں کا موسم کیسا ہو“

مرزا صاحب۔ ”چار قدم پر وہ جگہ ہے جہاں آپ تشریف لئے جا رہے ہیں وہاں کا موسم وہی ہے جو یہاں کا“

میر صاحب۔ ”پھر بھی اگر لحاف رکھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے اور ہاں مچھردانی بھی بستر ہی میں رکھ دینا“

دولت۔ ”سرکار مچھردانی کے بانس بھی“

میر صاحب۔ ”بانس ہیں تو ضروری مگر کیوں بھئی مرزا صاحب بانسوں میں ذرا طوالت ہے“

مرزا صاحب۔ ”جی بانس والس نہیں جو دیکھے گا ہنسے گا“

میر صاحب۔ ”اچھا بانس نہ رکھو ایک آدھ قالین اور ایک آدھ گاؤ تکیہ

بکسیں علیحدہ ضرور باندھ دینا"۔

مرزا صاحب۔ "یہ سب کیا ہوگا"۔

میر صاحب۔ "یعنی وہاں کیا بیٹھنے ویٹھنے کی ضرورت نہ ہوگی"۔

مرزا صاحب۔ "دن بھر کا قیام ہے اور ایک رات گذارنا ہے۔ اگر وہ ایسی کا ارادہ اس کے لئے یہ سب جھگڑا"۔

میر صاحب۔ "تو آخر بے سرو سامانی کے سفر سے کیا حاصل"۔

مرزا صاحب۔ "بہتر ہے اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مناسب ہے"۔

دولت۔ "سرکار اور کوئی چیز"۔

میر صاحب۔ "کپڑوں کے دونوں بکس۔ لوٹے۔ طشت۔ بیسن۔ صابن دانی منجن دان چاء کے لئے پتیلی انگیٹھی۔ کوئلوں کا تھیلہ۔ چاء کے سب برتن وغیرہ رکھ دئیے ہیں"۔

مرزا صاحب۔ "خدا کی پناہ آخر اتنا سامان"۔

میر صاحب۔ "بھائی پردیس کا معاملہ ہے کیا گھر سے یوں ہی چل دیا جائے"۔

(ملازمہ رونق کشتی لیے ہوئے داخل ہوتی ہے)

رونق۔ "اللہ سلامت رکھے——"

میر صاحب۔ "اری نیکبخت یہ کشتی میں کیا لائی ہے"۔

رونق۔ "قربان جاؤں سرکار۔ یہ بڑی بیگم کے یہاں سے گلوریاں پھول اور امام ضامن آیا ہے"

میر صاحب۔ "اچھا۔ اچھا۔ رکھوا سے اور بڑی بیگم کو سلام کہلا دو"۔

رونق۔ "سرکار ابھی تو اور کشتیاں بھی ہیں"۔

میر صاحب ۔ یعنی اور ہیں ابھی"!

رونق ۔ جی ہاں سرکار، اللہ رکھے سردار دلہن ۔ بہو بیگم ۔ شمشاد محل ۔ نور محل قمر دلہن سب ہی نے تو امام ضامن بھیجے ہیں "!

میر صاحب ۔ خوب خوب ۔ لاؤ بھئی وہ کشتیاں بھی لاؤ"!

رونق ۔ اور اللہ سلامتی رکھے بہو بیگم اور قمر دلہن نے ناشتہ بھی بھیجا ہے"!

میر صاحب ۔ اس تکلف کی آخر کیا ضرورت تھی خیر ناشتہ تو دولت کو دیدے اور کشتیاں یہاں لے آ!

رونق ۔ اور سرکار بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ ذری محل میں بھی تشریف لے آئیں"!

میر صاحب ۔ اچھا تو چل میں آتا ہوں ۔ کیوں بھئی مرزا تو میں ہو آؤں ذرا محل میں"!

مرزا صاحب ۔ بسم اللہ ۔ ضرور تشریف لے جائیں اور میرا آداب بھی عرض کر دیں ۔ بیگم صاحبہ سے اور صاحبزادی صاحبہ کو دعا"!

(میر صاحب گھر کے اندر تشریف لیجاتے ہیں)

بیگم ۔ اے میں کہتی ہوں کہ سدھارنے کا وقت آگیا ہے اور باہر سے آنے کو دل ہی نہیں چاہتا"!

میر صاحب ۔ نہیں تو بیگم میں تو بس آ ہی رہا تھا باہر مرزا صاحب اور شیخ صاحب کو ساتھ لے جانے کے لئے تیار کر رہا تھا"!

بیگم ۔ تو وہ تیار ہو گئے ۔ چلو اچھا ہوا دل بھی بہلے گا ۔ اور اکیلے بھی نہ ہوگے"!

میر صاحب ۔ ہاں صاحب بڑا اطمینان ہو گیا ۔ پردیس کا معاملہ ہے ایک سے دو بھلے"!

بیگم ۔ مگر میرا جی لگا رہے گا جاتے ہی خط ڈال دینا"!

میر صاحب۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے"۔

بیگم۔ اچھا جیسے آج اصل خیر سے گئے تو کب پہونچو گے"؟

میر صاحب۔ آج ہی بس دو بجے تک"۔

بیگم۔ چلو ہٹو۔ چلے ہیں مجھ سے مذاق کرنے چالیس کوس کا سفر ہے اور آج ہی پہونچ جائیں گے بچارے"۔

میر صاحب۔ تمہارے سر کی قسم بیگم بس دو گھنٹے بلکہ اس سے بھی کم میں پہونچ جائیں گے"۔

بیگم۔ آخر اتنا تیز جانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہو کر آدمی جائے"۔

میر صاحب۔ بھئی تو اس کو میں کیا کروں ریل ایسی ہی تیز چلتی ہے"۔

بیگم۔ اے ہے۔ مجھے تو ہول ہو جائے"۔

(باہر سے شیخ صاحب آواز دیتے ہیں)

جناب میر صاحب قبلہ اب ذرا جلدی کیجئے وقت قریب ہے۔

میر صاحب۔ بہت بہتر ہے میں تو بس آپ ہی کا منتظر تھا ابھی آیا۔

بیگم:۔ اے تو لاؤ میں امام ضامن باندھ دوں اور ذرا اسا دہی چکھ لو۔ اللہ اصل خیر سے واپس لائے"۔

صاحبزادی۔ ابا جانی۔ دہی مچھلی"۔

رونق۔ "سرکار دہی مچھلی"۔

بیگم۔ رونق ذری کشتیاں اٹھا میں امام ضامن باندھ دوں"۔

میر صاحب۔ ہاں ذرا جلدی کرو بیگم وقت بہت کم ہے"

بیگم۔ اے ایسی بھی کیا جلدی کہ ہاتھ پیر پھول جائیں تم ہی تو باہر بیٹھے ہے"

رونق۔ لیجئے سرکار یہ بڑی بیگم کے یہاں کی کشتی ہے"

بیگم۔ پہلے ہار اٹھاؤ"

رونق۔ "لیجئے"

بیگم۔ بسم اللہ۔ لاؤ امام ضامن بھی باندھ دوں"

رونق:۔ لیجئے سرکار"

بیگم۔ امام ضامن کی ضامنی"

میر صاحب۔ اور بھی سب جلدی جلدی باندھ دو۔ دیر ہو رہی ہے"

بیگم۔ پھر تم نے ہاتھ پیر پھلائے رونق "کشتیاں جلدی جلدی اٹھا"

رونق۔ لیجئے لیجئے لیجئے"

بیگم بسم اللہ لے یہ بہو بیگم کا کارچوب والا امام ضامن کیسا پیارا پیارا ہے"

رونق۔ سرکار یہ شمشاد محل کے یہاں کا ہار دیکھئے گوٹے کا ہے اور امام ضامن بھی اچھا ہے"

بیگم۔ سردار دلہن کو تو دیکھو یہ کیلا سلک کا امام ضامن بھیجا ہے اور پھر کیا اس میں پیسہ بندھا ہے"

رونق۔ نہیں سرکار اشرفی ہے یا شاید اٹھنی ہو"

بیگم۔ ہاں یہ ہے امام ضامن سردار دلہن دیکھیں تو تکتی رہ جائیں کیا

کہنا ہے قمر دلہن کا "

میر صاحب ۔ بس صاحب ہو گئے سب امام ضامن "

بیگم ۔ اے میرا امام ضامن تو بند ھوالو "

میر صاحب ۔ ہاں صاحب وہ سب سے زیادہ ضروری ہے اور ہاں بیگم

ایک ایک امام ضامن مرزا صاحب اور شیخ صاحب کو بھی بھجیدو "

بیگم ۔ اب چلے یہ چونچلے لے کے میں اب کہاں سے لاؤں امام ضامن "

میر صاحب ۔ ارے صاحب کسی کپڑے میں ایک ایک روپیہ باندھ دو بس "

بیگم ۔ اچھا تم باہر چلو میں بھیجتی ہوں "

میر صاحب ۔ اچھا خدا حافظ "

بیگم ۔ جاؤ اللہ کی امان امام ضامن کی ضامنی داہی مچھلی "

رونق ۔ میاں داہی مچھلی "

صاحبزادی ۔ میاں داہی مچھلی "

(میر صاحب گھر کے باہر آتے ہیں)

شیخ صاحب ۔ خیر خدا خدا کر کے آپ نکلے تو گھر کے باہر "

مرزا صاحب ۔ اور ذرا شان تو دیکھئے معلوم ہوتا ہے دولھا میاں آرہے ہیں "

شیخ صاحب ۔ خیر دولھا میاں نہ سہی مگر حاجی صاحب تو ضرور معلوم ہوتے

ہیں ان ہاروں اور امام ضامنوں میں "

میر صاحب ۔ بھئی کیا بتاؤں عورتیں جو چاہیں بنا دیں "

شیخ صاحب ۔ اچھا تو اب گھی منگوائیے نا ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے "

میر صاحب۔ دولت سب سامان تیار ہے؟

دولت۔ جی ہاں سرکار سب سامان تیار ہے کل تیس عدد ہیں؟

میر صاحب۔ تاش کی گڈی۔ چوسر۔ شطرنج یہ سب رکھ لیا ہے؟

دولت۔ جی ہاں سرکار یہ سب چیزیں ہیں مگر سرکار۔

میر صاحب۔ مگر کیا کچھ بھول گئے۔ تمہارے دماغ میں تو بھوسہ بھرا ہے۔

دولت۔ میں نے کہا سرکار کی بٹیریں حضور کو یاد کریں گی۔

میر صاحب۔ بٹیریں۔ خوب یاد دلایا بھئی ان کے کابک ساتھ لے لو ورنہ وہ واقعی بھڑک جائیں گی۔

دولت۔ تو اب تینتیس عدد ہوئے۔

میر صاحب۔ کوئی پروا نہیں تم اب وہ بگھیاں فوراً لے آؤ۔

(رونق گھر سے آتی ہے)

رونق۔ سرکار بیگم صاحبہ نے مرزا صاحب اور شیخ صاحب کے لئے یہ امام ضامن بھیجے ہیں اور یہ بار بار کہا ہے کہ جب سے مٹھو بیٹے کو آپ کے سدھارنے کی خبر ہوئی ہے۔ وہ برابر ٹیں ٹیں کر رہے ہیں۔

میر صاحب۔ ارے بھئی یہ تو بڑی مصیبت ہے واقعی مٹھو بیٹے تو سخت پریشان کریں گے سب کو۔

رونق :" اے سرکار وہ تو ذرا دیر بھی اگر حضور کو نہ دیکھے تو آفت مچا دیتا ہے۔"

میر صاحب :" کیا راٹے ہے مرزا صاحب جہاں اتنا سامان ہوا ہے وہاں ایک پنجرہ اور سہی "

مرزا صاحب ۔ جو رائے عالی ہو مگر اتنے سامان کا تو محصول پڑ جائے گا "

میر صاحب :" بھئی تو تم ہی بتاؤ کون سی چیز ضرورت سے زیادہ ہے بغیر پاندان کے کام نہیں چل سکتا بغیر ناشتہ دان کے کیسے چل سکتے ہیں۔ اور اسی طرح سب چیزیں ضروری ہیں "

شیخ صاحب :" واللہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ولایت کا سفر ہے "

مرزا صاحب :" ہاں اور کیا جتنے آدمی ولایت جاتے ہیں وہ سب طوطے کا پنجرہ اور بٹیر کے کابک لے جاتے ہیں ـــــ "

میر صاحب :" تو بھئی میں ان بے زبانوں کی جان تو لوں گا نہیں چاہے جو کچھ بھی ہو "

شیخ صاحب ۔ نہیں صاحب ہرگز نہیں بہر حال اب سامان نکلوانا چاہئے بگھیاں آتی ہی ہوں گی "

میر صاحب :" آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے دولت آتا ہی ہوگا "

مرزا صاحب ۔ اپنا کام کرنے میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ آپ نے ایک ہی کہی واللہ ہے کہ میں سامان نکالتا ہوں "

میر صاحب :" اماں تمہیں میری قسم جو سامان اٹھاؤ یہ بھی کوئی بات ہے "

(دولت گاڑیاں لے کر آتا ہے)

دولت - سرکار بگھیاں حاضر ہیں ایک ایک رتھ بھی آئی ہیں۔"

میر صاحب - اچھا تو سامان رکھواؤ گاڑی پر اور دیکھو باہر کوئی عورت سامنے نہ آنے پائے اور نہ کوئی ایسا ویسا آدمی"

دولت "کیا مجال ہے سرکار میں راستہ بند کرائے دیتا ہوں"

میر صاحب "اچھا تو بھئی مرزا میں ایک مرتبہ ذرا پھر گھر میں ہو آؤں"

شیخ صاحب "بس تو پھر گاڑی مل چکی"

صبیر صاحب "اماں ابھی آیا میں بس سامان رکھا گیا کہ میں آ گیا"

مرزا صاحب "ہاں ہاں آپ ضرور ہو آئیں مگر ذرا جلدی کیجئے"

میر صاحب "بس میں ابھی آیا تم سامان رکھوا دو"

مرزا صاحب "دیکھو دولت کوئی چیز رہ نہ جائے"

دولت "کیا مجال ہے سرکار مگر ایک بگھی میں تو سب سامان ہی آئے گا"

مرزا صاحب "بس تو ایک میں ہم سب آجائیں گے"

شیخ صاحب "مگر یار طوطے کا پنجرہ اور بٹیروں کی کابک میر صاحب کے پاس ہی رکھنا"

مرزا صاحب "ہاں یہ بھی اچھی دل لگی رہے گی"

(نواب صاحب گھر سے برآمد ہوتے ہیں)

نواب صاحب "لیجئے جناب میں آگیا"

مرزا صاحب "بس تو بسم اللہ کیجئے"

(دولت کو یکایک چھینک آجاتی ہے "آچھیں")

میر صاحب: "لاحول ولا قوۃ۔ آؤ بھئی مرزا ذرا بیٹھ جاؤ شگون خراب ہوگیا ایک ایک پان کھالو پھر چلیں گے۔ اس بدتمیز کو دیکھو کہ اسی وقت بدشگونی سوجھی تھی"

شیخ صاحب: "اچھا خیر ہوگا بھی ایک ایک پان کھا لیجئے"

مرزا صاحب: "لیجئے مہترانی بھی آگئی ——"

مہترانی: "اللہ سلامتی رکھے۔ ڈیوڑھی آباد"

دولت: "ہٹ ہٹ سامنے سے ہٹ۔ سرکار سدھار رہے ہیں"

میر صاحب: "خیر یہ بھی اچھا ہی ہوا بہرحال اب پان کھا کر چلتے ہیں"

دولت: "سرکار پان حاضر ہیں"

میر صاحب: "لو بھئی مرزا صاحب اب اٹھو"

شیخ صاحب: "بسم اللہ"

مرزا صاحب: "الا اللہ"

میر صاحب: "چل دولت باہر سب کو ہٹا دے"

دولت: "حضور باہر کوئی نہیں ہے تشریف لے چلیں"

(یکایک بلی کی آواز آتی ہے)

میر صاحب۔ "کمبخت راستہ کاٹ گئی"

مرزا صاحب: "یہ تو بہت برا ہوا کہ بلی راستہ کاٹ گئی"

میر صاحب: "لوٹ آؤ بھائی شیخ صاحب یہ شگون نہایت منحوس ہوتا ہے"

(اندر سے رونق آتی ہے)

رونق: "سرکار بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ بلی راستہ کاٹ گئی ہے۔ اب میں

ہرگز نہ جانے دوں گی۔

میر صاحب۔ ہے تو واقعی یہ برا امگر مقدمہ کا کیا ہوگا!

رونق "سرکار جاں داد آپ پر سے صدقے کی مگر جب بلی راستہ کاٹ جائے تو جانا نہ چاہیئے"

میر صاحب "واقعی اب تو میرے قدم بھی نہیں اٹھتے!"

شیخ صاحب "حقیقت یہ سب وہم ہیں بالکل عورتوں کی باتیں ہیں۔"

میر صاحب "ابھی شیخ صاحب یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اماں یہ کیا کہہ رہے ہو یعنی بلی راستہ کاٹ جائے اور تم اس کو معمولی بات کہو!"

مرزا صاحب "نہیں صاحب یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے ایسی حالت میں سفر ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

میر صاحب "بھائی شیخ صاحب میں تم سے سچ کہتا ہوں تمہارے سر عزیز کی قسم کہ ابا جانی مرحوم کے ایک دوست گھوڑے پر سوار تھے اور جنگل کا راستہ تھا کہ بلی راستہ کاٹ گئی بس پھر کچھ نہ پوچھو کہ گھوڑے کا ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے ٹھوکر لی اور سوار سر کے بل گرا۔"

مرزا صاحب "ارے رے۔ بڑی چوٹ آئی ہوگی جناب"

میر صاحب "اماں چوٹ۔ یقین جانو کہ تمام پیشانی لہولہان ہوگئی"

شیخ صاحب "اتفاقاً ہو گیا ایسا یہ کیا ضروری ہے کہ ہر مرتبہ ایسا ہی ہو۔"

رونق "ارے واہ میاں اللہ نہ کرے ایسا ہو میرا تو سنکر ہی کلیجہ دھڑک رہا ہے"

میر صاحب: "بھئی شیخ صاحب بعض وقت تو تم نہایت ناسمجھی کی باتیں کرتے ہو گویا یہ شگون اور بدشگونی کوئی چیز ہی نہیں۔"

شیخ صاحب: "صاحب میں تو ان باتوں کو مہمل سمجھتا ہوں۔"

مرزا صاحب: "بھائی صاحب یہ تو نہ کہئے البتہ یہ کہئے کہ آپ کچھ نئی روشنی کے آدمی ہو کر رہ گئے ہیں۔"

میر صاحب: "اماں تمہیں میری قسم ذرا دیکھو تو شیخ صاحب کی ڈھٹائی کہ بلی راستہ کاٹ جائے اور یہ شیر ڈٹا ہوا ہے۔"

مرزا صاحب: "خیر اب سفر تو میری ناچیز رائے میں مناسب نہیں ہے۔ البتہ خیال ہے تو صرف یہ کہ مقدمہ کا کیا ہوگا۔"

رونق: "اے میاں چولہے میں گیا موا مقدمہ، اللہ جان کی سلامتی رکھے تو ایسے ایسے سیکڑوں مقدمہ ہوں گے۔"

میر صاحب: "بھئی واللہ یہ بھی ایک ہی رہی اماں سنتے ہو مرزا ان بی رونق کی دعا کو ایسے ایسے سیکڑوں مقدمے میرے لئے مانگ رہی ہیں۔"

رونق: "اے تو قربان جاؤں مجھے کیا معلوم۔"

میر صاحب: "تو بھئی مرزا اب تم ہی بتاؤ کہ اس مقدمہ کا کیا کیا جائے۔"

مرزا صاحب: "حضرت میری عقل خود حیران ہے۔"

(دولت ملازم آتا ہے)

دولت: "سرکار تو کیا سامان اتار لیا جائے۔"

میر صاحب: "سامان تو خیر ضرور اترے گا۔ خواہ مقدمہ رہے یا جائے۔"

دولت: "تو سرکار بگھی والوں کو تو کرایہ دینا ہی پڑے گا"

میر صاحب: "ہاں ہاں تو کس نے کہا ہے کہ نہ دو"

مرزا صاحب: "میری ناقص رائے میں تو حاکم کو تار دیدیا جائے"

میر صاحب: "آخر کیا تار دیا جائے"

شیخ صاحب: "یہی کہ بلی راستہ کاٹ گئی اور ملازم کو چھینک آ گئی"

مرزا صاحب: "نہیں صاحب بس یہ تار دیدیا جائے کہ گاڑی چھوٹ گئی"

شیخ صاحب: "قبلۂ عالم یہ بھی خبر ہے کہ جہاں آپ کو جانا ہے وہاں دن بھر میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہر گھنٹہ پر گاڑی چھوٹتی ہے"

میر صاحب: "اماں تو کچھ اور سوچو"

شیخ صاحب: "آخر تو اس میں کیا مضائقہ ہے کہ آپ اب دوسری گاڑی سے چلیں"

میر صاحب: "بھائی اب بیگم صاحب ہرگز نہ جانے دیں گی"

شیخ صاحب: "تو یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جاڑا دکا معاملہ ہے کہیں خدانخواستہ جائداد کھٹائی میں نہ پڑ جائے"

میر صاحب۔ کیا عرض کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

(رونق ملازمہ آتی ہے)

رونق: "سرکار بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ اب کچھ ہی ہو جائے میں ہرگز نہ جانے دوں گی"

میر صاحب: "ارے صاحب تو میں کہاں جا رہا ہوں"

مرزا صاحب: "تو اب فرمائیے کہ کس مضمون کا تار دے دیا جائے"!

میر صاحب: "میرے خیال میں تو بس یہی تار دیدو کہ مجبوراً سفر ملتوی کر دیا ہے"!

شیخ صاحب: "جناب والا اس کا اثر مقدمہ پر کیا پڑے گا"!

مرزا صاحب: "مگر بھائی مجبوری کی وجہ سے سفر ملتوی کیا ہے نا"!

شیخ صاحب: "کیا مجبوری ہے آخر یہی نا کہ چند وہم گھیرے ہوئے ہیں"!

میر صاحب بھئی شیخ صاحب تم تو واللہ ہے کہ ان باتوں کو پھر وہم کہہ رہے ہو بس بلی راستہ کاٹ جائے اور وہم"!

مرزا صاحب: "نہیں صاحب یہ وہم نہیں ہے بلکہ اچھی احتیاط شرط ہے آخر ہمارے بزرگ کیا کرتے تھے"!

میر صاحب۔ میں آپ سے عرض کروں کہ ہمارے بزرگ تو ان ہی خیالات کی وجہ سے سفر ہی کو مناسب نہ سمجھتے تھے۔

(دولت گھبرایا ہوا آتا ہے)

دولت: "سرکار۔ سرکار غضب ہو گیا۔ ایک بگھی کا گھوڑا اکڑ کر بھاگا ہے مع تمام سامان کے اور بٹیروں کے کابک بھی اسی بگھی پر ہیں"!

میر صاحب۔ الٰہی خیر۔ خدا میری بٹیروں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے ذرا دیکھو بھئی مرزا۔ اماں ذرا جاؤ شیخ صاحب۔

رونق۔ وہ تو موا شگون ہی خراب ہو گیا تھا۔ اس موٹے نکٹے دولت کو بھی اسی وقت چھینک آنا تھی"

دولت۔ ذرا زبان سنبھالے ہوئے۔ نکٹا میں کیوں ہوتا جو کہے وہ خود

اور اس کی سات پشت"

رونق۔ دیکھئے سرکار یہ مو امیری پشتوں کو بھی منہ بھر بھر کے کہہ رہا ہے"

میر صاحب۔ ارے صاحب یہ لڑائی کا وقت نہیں ہے خدا کو یاد کرو۔ میری بٹیریں اس وقت سخت مصیبت میں ہیں"

مرزا صاحب۔ لیجئے حضت اپنی بٹیریں میں نے جاتے ہی گھوڑے کو پکڑ لیا"

میر صاحب۔ بھئی واللہ کمال کیا۔ اماں ذرا دیکھو تو بٹیروں کا دل کیسا دھڑک رہا ہے۔ مگر واللہ ہے کہ خدا نے ہم لوگوں کو کیسا بچایا"

شیخ صاحب۔ صرف آپ کی صراحی گر کر ٹوٹی باقی سب خیریت ہے"

میر صاحب۔ خیر بھئی صراحی گئی تو جائے سب کی جانوں کا صدقہ اترا"

مرزا صاحب۔ ہاں صاحب۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

شیخ صاحب۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا ہنگامہ ہوا ہے بیٹھے بٹھائے"

میر صاحب۔ ایسا ویسا ہنگامہ۔ ذرا میرا کلیجہ کو دیکھو۔ کہ اب تک بے قابو ہے۔ ذرا دولت شربت انار تیار کرو۔ اور بھئی مرزا میں ذرا محل میں ہو آؤں تاکہ بیگم کو اطمینان ہو"

مرزا صاحب۔ تو ہم لوگ اجازت چاہتے ہیں"

میر صاحب۔ اچھا بھئی خدا حافظ"

شیخ صاحب۔ آداب بجالاتا ہوں"

مرزا صاحب۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں"

پنشن

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ۔ ع

تقریب کچھ تو بہر خرافات چاہیئے ——

چنانچہ آج بھی تقریب تو یہ ہے کہ خان صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی انسپکٹر وخاتمہ رجسٹریشن اپنی مدت ملازمت ختم کرکے پنشن پر تشریف لے جا رہے ہیں اور ان کو صاحب انسپکٹر جنرل بہادر کے دفتری عملہ نے الوداعی دعوت دی ہے اب اس تقریب کے سلسلہ کی خرافات یہ ہے کہ اس خاکسار سے الوداعی نظم پڑھنے کی فرمائش کی گئی ہے۔ مگر چونکہ یہ خاکسار اس محکمہ رجسٹری کا رجسٹرڈ شاعر نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو اختیار ہے کہ نظم خواہ اشعار کی موزونیت کے ساتھ پڑھے یا شعر کی سپاٹ جذبات نگاری کے ساتھ۔

بہر حال امر واقعہ صرف یہ ہے کہ اس قسم کے مواقع پر نظم تو وہ پڑھ سکتا ہے جس کو زندگی بھر روزی اور موت دونوں سے بے فکر رہ کر صرف داد حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے مگر چونکہ اس خاکسار کے نزدیک اس قسم کی نظموں میں زندگی کے نکات و رموز مستقبل کے نشیب و فراز۔ مدبرانہ مشورے۔ حکیمانہ پند و نصائح اور استادی کے دیگر گر نہیں سما سکتے۔ لہٰذا کیوں نہ اپنی مادری زبان میں انسانی

کی گفتگو کی جائے اور اپنے خیالات کو ردیف قافیہ کی مجبوریوں میں کیوں مبتلا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس موقع پر یہ خاکسار نظم کہتا تو زیادہ سے زیادہ اس نظم میں یہی ہوتا کہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ چڑیوں کے چہچہے خاموش ہیں بہار پر خزاں کا فالج نما حملہ ہوا ہے۔ گلستاں میں ویرانہ کا ویران منظر ہے۔ دنیا میں اندھیرا ہے اس لئے کہ خان صاحب چودھری سراج الحق آج ملازمانہ بندشوں سے آزاد ہو کر پنشن پر جا رہے ہیں ایک دیرینہ رفیق چھوٹ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نظم میں چودھری صاحب کے کچھ ایسے صفات بیان کئے جاتے جنسے شاعر اور تمام کے شجرہ کے تمام مرحوم اور موجودہ بزرگ بلکہ شاعر کے فرشتے بھی ناواقف محض ہوتے پھر اس نظم میں کچھ دعائیہ اشعار ہوتے اور اسکے بعد مقطع۔ گویا بحیثیت مجموعی یہ نظم کذب و افترا کا ایک دفتر اور تصنع بلکہ منافقت کا ایک ایسا مجموعہ ہوتی کہ سننے والے بھی شاعر کو کذاب سمجھتے اور عاقبت میں اس افترا پردازی کی جواب دہی بھی کرنا پڑتی لہذا سب سے بہتر اور محفوظ صورت یہی سمجھ میں آئی کہ ناموزونیت کے ساتھ محض سچ بولا جائے۔ تاکہ اپنے جذبات کا سلیس اردو میں اظہار بھی ہو جائے اور کوئی گناہ بھی سرزد نہ ہو۔

اس مختصر تمہید کے بعد یہ خاکسار چودھری صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پنشن کے فلسفہ پر اجمالی روشنی ڈالنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ ایک ملازم نما انسان یا انسان نما ملازم کی زندگی کا ایک اہم ترین انقلاب یہ پنشن ہی ہے بلکہ مجھکو کہنے دیجئے کہ جس طرح عام انسانوں کی زندگی تین حصوں میں تقسیم ہے۔ یعنی بچپن۔ جوانی اور بڑھاپا اسی طرح ایک ملازم نما انسان کی زندگی بھی تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہے

تعلیم ۔ یہ ملازم کا بچپن ہے۔ ملازمت یہ ملازم کی جوانی ہے اور پنشن یہ ملازم کا بڑھاپا ہے۔ ان باتوں کو چودھری صاحب موصوف خود بھی جانتے ہوں گے۔ اس لئے کہ وہ ماشاء اللہ عاقل بالغ ہیں۔ عاقل تو خیر وہ ہمیشہ سے ہیں مگر ایک سرکاری ملازم پنشن لینے کے بعد بالغ بھی ہو جاتا ہے یا یہ کہئے کہ اس کو پنشن لینے کے بعد ہی اپنے بلوغ کا احساس ہوتا ہے۔ بہرحال چودھری صاحب اب مسلم طور پر عاقل و بالغ ہیں اور ان نکات کو وہ خوب سمجھ سکتے ہیں۔ کہ در اصل ایک ملازم کی زندگی کے یہ تینوں دور ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ دو دور تو چودھری صاحب دیکھ آئے اب پنشن کے انقلاب کو دیکھنا باقی ہے اور اس انقلاب کے لئے وہ ہر طرح تیار ہیں۔

پنشن در اصل ایک انسان کے تمام ماحول کو $\frac{1}{2}$ بنا دینے کا دوسرا نام ہے ملازم کا ماحول کیا ہے صرف اس کی تنخواہ اور واقعہ بھی ہے کہ ایک سرکاری ملازم کی دنیا جس محور پر رقص کرتی ہے وہ صرف تنخواہ ہے لیکن پنشن کے بعد جب تنخواہ ہی $\frac{1}{2}$ رہ جائے تو پنشنر خود اپنے کو بھی $\frac{1}{2}$ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس کو اپنی زندگی کے $\frac{2}{3}$ حصہ کو $\frac{1}{2}$ کی مناسبت سے بسر کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال یہ چونکہ ریاضی کا مسئلہ ہے۔ لہذا اس کو اکاؤنٹنٹ صاحب پر چھوڑ کر مجھکو یہ عرض کرنے دیجئے کہ اب چودھری صاحب اپنی مسلّم دنیا کو چھوڑ کر اس ادھوری دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ جہاں ان کو اپنی تمام ضروریات کو نصف بنانا ہے تاکہ پنشن کی آمدنی اور بڑھاپے کے خرچ کا توازن درست رہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے۔ کہ ایک پنشن یافتہ اپنے اخراجات کو اس حد تک نصف کرے کہ ایک ہی

پائینچے کا پاجامہ پہننے لگے ایک ہی آستین کا کرتہ پہنے ایک ہی جوتا خریدے ایک ہی
تال کی عینک لگائے۔ محض انٹرول تک سنیما دیکھے۔ آدھی دور پیدل چلے اور
آدھی دور تانگہ پر۔ دو کے بجائے صرف ایک روٹی کھائے اور نصف بہتر کی
ہر دو فرمائشوں میں سے صرف ایک کو پورا کرے۔ بلکہ مصیبت تو یہ ہے کہ ان میں سے
کوئی بات بھی نہ ہو اور آدھا ہو جائے یہ در اصل ایک ایسا معمہ ہے جس کو صرف وہی
حل کر سکتا ہے جو پنشن پا کر اپنے فرصت کے اوقات میں دماغ سوزی سے کام لے اور
اس عقدہ کے حل کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ چودھری صاحب کے پاس
اب وقت بھی ہے۔ اور فرصت بھی اور سوائے اس کے اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے
کہ سب سے پہلے اسی مسئلہ کو طے کیا جائے۔ یقین جانئے کہ چودھری صاحب، دونوں
پیروں میں جوتے پہنیں گے اور اس کو بھی پسند نہ کریں گے۔ کہ پاجامہ کے بجائے
نیکر استعمال کرنا شروع کریں البتہ بجٹ کی صورتیں اور خرچ کا توازن اب اس طرح قائم
ہو گا۔ کہ چھ روپے کے جوتے کے بجائے اب تین روپے کے جوتے سے کام چل جائے گا
موزوں کے لئے یہ کوئی ضروری بات نہ ہو گی کہ وہ خاص مسٹر روز ولٹ کے ہاتھ کے
بنائے ہوئے ہوں لباس بھی اسی طرح سادہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ بڑھاپے میں
تکلفات کی آخر ضرورت ہی کیا ہے نہ جوانی ہے نہ اب جوانی کی خود ستائی اور
خود نمائی۔ اور غالباً اسی وجہ سے سرکاری نقطۂ نظریہ قائم ہو گیا ہے کہ انسان کو
اس زمانہ میں پوری تنخواہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی مگر یہ خاکسار جو بفضلہ بوڑھا نہیں
ہے البتہ بڑھاپے کے غم میں دبلا ضرور ہے اس کلیہ اور اس نظریہ کو سمجھنے سے قاصر ہے
کہ جوانی کے اخراجات بڑھاپے سے دو چند اور بڑھاپے کے مصارف جوانی سے نصف

ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بڑھاپے میں کریم، اسنو۔ عطر، پاؤڈر اور اسی قسم کی دوسری چمک دمک کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ انسان ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے مگر اسی کے ساتھ بڑھاپے کے مزید اخراجات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ بڑھاپے میں جوانی کی تشکیل کیلئے انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً خضاب کے اخراجات، دانتوں کی اکھڑوائی اور بنوائی۔ پیری اور صد عیب کے مصارف اور مختلف ادویات کے مصارف اور مختلف ادویات کی قیمتیں پھر ایک بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ اسی زمانہ میں انسان کو خیرات کی بھی فکر ہوتی ہے اور وہ زندگی بھر کی کسر نکالنا چاہتا ہے مختصر یہ کہ اگر کچھ مصارف کم ہو جاتے ہیں تو اس سے دو چند بڑھ جاتے ہیں اور یہ اخراجات ایسے ہوتے ہیں جو عمر کے ساتھ بڑھتے رہتے ہیں لہٰذا ان اقتصادی نشیب و فراز کو چودھری صاحب خود سمجھ سکتے ہیں اور وہ یقیناً اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش فرمائیں گے۔

پنشن کا دور اور بہت سی حیثیتوں سے بھی انقلابی ہوتا ہے مگر باقی انقلابات ایک حد تک خوش گوار کہے جا سکتے ہیں جن کا احساس چودھری صاحب کو اب ہوگا یقین جانئے کہ اب تک چودھری صاحب کی زندگی یہی ہوگی کہ وہ ۲۴ گھنٹہ سے ۲۵ گھنٹے انسپکٹر و خاتہ رجسٹریشن رہتے ہوں گے اور اپنی ذاتی شخصیت کو سمجھنے کا آپ کو کبھی موقع ہی نہ ملتا ہوگا۔ سوتے ہیں خواب اسی انسپکٹری کے دیکھتے ہوں گے اور جاگتے ہیں اسی انسپکٹری کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کی دعائیں دل

بر وز بہم

سے نکلتی ہوں گی آپ کے نزدیک جنت کا تخیل صرف یہ ہوگا کہ صاحب انسپکٹر جنرل بہادر آپ سے خوش ہیں اور آپ کی خدمت کو سراہتے ہیں اور عاقبت کا تخیل زیادہ سے زیادہ یہ کہ نیک نامی کے ساتھ پنشن مل جائے۔

مگر اب پنشن حاصل کرنے کے بعد آپ کو انسپکٹری کے بجائے اپنی انسانی حیثیت پر غور کرنے کا موقع بھی ملے گا اور اس کا علم بھی ہوگا کہ عاقبت یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے ایک دوسری منزل کا نام ہے چنانچہ اب اس نصف تنخواہ کے زمانے میں تسبیح و جا نماز، چٹائی اور بدھنی کے مصارف کا بھی اضافہ ہوگا اور نماز کے ساتھ اوراد و ادعیہ اور وظائف بھی شروع ہو جائیں گے۔ اکثر پنشن پانے والے بزرگ اپنی بیکاری سے گھبرا جاتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں۔ کہ آخر کیا کریں مگر جو صاحبان ہوش اور جن کا دیدۂ عبرت نگاہ چشم سے بے نیاز ہے یعنی جو گوش نصیحت نیوش کے بہرے نہیں وہ جانتے ہیں کہ ع

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

کا مفہوم کیا ہے اور ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہوتا ہے لہذا وہ قضائے عمری میں اپنا وقت گذارتے ہیں اور عبادت کی فراوانی فرصت کو محدود ثابت کر دیتی ہے۔

بہر حال ان تمام منازل سے چودھری صاحب کو بھی گذرنا ہے اور چودھری صاحب ہی پر کیا منحصر ہے ان کے وہ تمام میزبان جو آج عرضی فدوی ہیں کل پنشنر بننے والے ہیں ۔

ازل سے سب ملازم گویا پنشن خوار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

چودھری صاحب کے جانے اور پنشن پانے کا غم وہ کرے جو آپ کا دشمن ہو جس کو آپ کی یہ روحانی، جسمانی، دماغی اور ذہنی آزادی بری معلوم ہوتی ہو اور جو یہ نہ دیکھ سکتا ہو کہ ایک طائرِ آزاد اپنے سیمیں قفس سے آزاد ہو کر فضا میں فراٹے کیوں بھر رہا ہے۔ مگر کم سے کم یہ خاکسار تو چودھری صاحب کی ذاتی زندگی کا آغاز اسی لمحہ سے سمجھ رہا ہے اور اس کو مبارکباد دیتا ہے کہ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہوئے ہیں۔ ان کے ماتحتوں کا جذبہ یہ ہے کہ آج سب باچشمِ نم ان سے رخصت ہو رہے ہیں اور ان کے افسران کا رویہ یہ ہے کہ خود صاحب انسپکٹر جنرل بہادر ان کو الوداع کہہ رہے ہیں گویا آج ماں باپ کی یہ دعا قبول ہوئی ہے کہ بڈھے ہو پروان چڑھو بڈھا ہونا تو سب سمجھ رہے ہیں اور سمجھنے سے زیادہ دیکھ رہے ہیں مگر یہ کسی کو نہیں معلوم کہ پروان چڑھنا دراصل پنشن پر جانے کو کہتے ہیں۔

اگر میں لیڈر ہوتا

وہ تو کہیئے کہ ہم تھوڑے سے شاعر اور تھوڑے سے ایڈیٹر ہو کر رہ گئے ورنہ اگر کہیں لیڈر بن جاتے تو مزہ ہی آجاتا۔ لیڈر بن جانے کے بعد عجیب زندگی ہوتی اور اس زندگی کو کچھ اس طرح بسر کرنا پڑتا کہ عجوبۂ روزگار بن کر رہ جاتے دنیا کی نظریں ہمارے اوپر ہوتیں اور ہماری نظریں ان اخبارات پر جن میں ہماری تصویر اور ہمارے کارٹون چھپا کرتے حالانکہ کارٹون کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اس لئے کہ لیڈر بن جانے کے بعد ہماری یہ تصویر بجائے خود کارٹون ہوتی عجیب و غریب شکل و صورت کے ساتھ عجیب و غریب لباس میں جو تصویر ہو اسے ہم تصویر سے زیادہ کارٹون کہتے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک کارٹون کی تو اب بھی یہی تعریف ہے کہ تصویر تو وہ ہے جو عجیب و غریب نہ معلوم ہو اور کارٹون اس تصویر کو کہتے ہیں جو عجیب و غریب معلوم ہو اس کے علاوہ ہمارے خیال میں جو تصویر عجیب و غریب نظر آئے وہ کسی لیڈر کی نہیں

ہو سکتی لہٰذا ثابت ہوا کہ ہماری ہر تصویر کارٹون ہوئی اور ہم خود دل ہی دل میں اپنی تصویر کے متعلق کہا کرتے کہ عجب چیز واقع ہوئے ہیں ہم بھی۔ بات یہ ہے کہ ایک لیڈر اور ایک عام انسان میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق ایک لیڈر اور ایک عام انسان کے لباس میں ہونا چاہیئے۔ وہی فرق ایک عام انسان کی شکل وصورت اور ایک لیڈر کی شکل وصورت میں ہونا چاہیئے۔ وہی فرق ایک عام انسان کی اور ایک لیڈر کی ہر نقل وحرکت میں ہونا چاہیئے چنانچہ ایسا ہی ہوتا بھی ہے کہ ایک لیڈر کا لباس عام انسانوں سے کچھ مختلف ہو کر تھوڑا بہت روحانی لباس بن جاتا ہے۔ ایک لیڈر کی شکل عام انسانوں سے کچھ علیحدہ ہو کر الف لیلی کی تصاویر سے مشابہ ہو جاتی ہے اور ایک لیڈر کی نقل وحرکت عام انسانوں سے ممتاز ہو کر کچھ جنون کی سی نقل وحرکت بن جاتی ہے۔ ورنہ یہ بھی نہ غور کیجئے کہ ایک لیڈر آخر پہچانا کیسے جائے اور اس کو لیڈر کون کہے۔ بہرحال ہم اگر لیڈر ہوتے تو ہمارا بھی یہی حال ہوتا کہ لباس پر نور برستا اور چہرے پر کھدر۔ چہرے پر متانت پیدا کرتے اور لباس سے دعوت تبسم دیتے۔ اب تو حال یہ ہے کہ جتنا اچھا لباس پہن کر جس قدر اکڑتے ہیں اتنا ہی بڑا آدمی اپنے کو سمجھتے ہیں لیکن لیڈر ہوتے تو جتنا معمولی لباس پہنتے اور جس قدر کسر نفسی کے ساتھ مسکراتے اسی قدر بلند مرتبہ ہم کو ملتا اب تو یہ فکر رہتی ہے کہ کوئی ہمارے چہرے سے ہماری فاقہ مستی کا راز معلوم کر لے۔ لیکن لیڈر ہونے کی صورت میں محظوظ زندگی کے تمام آثار چہرے ہی سے نمایاں کرنا پڑتے۔ مختصر یہ کہ جو زندگی اب بسر کر رہے ہیں اس کو لیڈری کی زندگی سے کوئی نسبت ہی نہ ہوتی۔ اب تو مرغن غذا، عمدہ لباس

اور گرم جیب ہماری زندگی کا سہارا بنی ہوتی ہے لیکن لیڈر کی صورت ان تمام سطحی چیزوں سے بحال نہیں رہتی بلکہ اس کے خون میں گرمی تو اس وقت پیدا ہوتی کہ جب اس کا نام لے کر زندہ باد کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ اس کا جلوس نکالا جاتا ہے، اس پر پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ اس کی گاڑی میں بجائے گھوڑے یا بیل کے انسان جوتے جاتے ہیں اور اس کے دیکھنے کے لئے سڑکوں پر دو رویہ ایسا مجمع ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر سوار ہو کر اپنی حسرت دیدار کی تکمیل کرتے ہیں جس وقت یہ اعزاز ہم کو حاصل ہوتا ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ ہمارا وزن بڑھ جاتا ہمارے بہت سے امراض بغیر کسی دوا کے دور ہو جاتے اور ہمارا خون بغیر کسی ٹانک کے بڑھ جاتا ہم ہاتھ جوڑ جوڑ کر۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر گردن ہلا ہلا کر اور مسکرا مسکرا کر مجمع کے سلاموں کا جواب دیتے اور دل یہی چاہتا کہ جلوس کا راستہ دس پندرہ میل اور طویل ہو جائے اور جس گاڑی پر ہم سوار ہیں اس کی رفتار کچھ اور کم ہو جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ دیر تک ہم اپنی ان پرستاریوں کا منظر دیکھ سکیں جلوس کے اختتام پر ہم جلسہ گاہ میں لائے جاتے اور ہمارے پہونچتے ہی وہاں ایک کھلبلی مچ جاتی لوگ ہمارے نام کے ساتھ سیکڑوں نعرے بلند کرتے ہم پر پھولوں کی مسلسل بارش ہوتی اور آخر کار ہم باوجود اس تمام افتخار کے اپنے نزدیک "سرضی فدوی" بنے ہوئے پلیٹ فارم پر آتے اور ہم کو ہاروں سے لاد دیا جاتا ہم کو جتنی عزت دی جاتی اسی قدر ہم خاکسار اور منجمد اس قسم کے ہو جاتے اور آخر کار تالیوں کے شور اور نعروں کے ہنگامے میں ہم تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے۔ مصور مختلف زاویوں سے ہماری تصویر لیتے۔ کسی میں منھ کھلا ہوا تو کسی میں آنکھ بند کسی میں منھ چڑھاتے

ہوتے تو کسی میں ہاتھ مٹکاتے ہوئے مگر ہم ان اٹھا دینے کی طرف گویا متوجہ بھی نہ ہوتے حالانکہ ہماری تمام تر توجہ اسی طرف ہوتی کہ کوئی تصویر بےڈھنگی نہ ہو مگر چونکہ اس احتیاط کا اظہار ہماری لیڈری کے شایان شان نہ ہوتا لہذا ہم دل ہی دل میں سنبھلتے اور خاموشی کے ساتھ ان تمام احتیاطوں کو پیش نظر رکھتے اور بظاہر صرف تقریر کر رہے ہوتے کہ۔ اے میرے بھائیو! ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

کیا مجھ کو تمہاری طرح ریشم ملائم نہیں معلوم ہوتا، لیونڈر میں خوشبو نہیں آتی اور دوسری ولایتی چیزیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں مگر میں اپنے ہندوستانی فاقہ مست بھائیوں سے غداری کرنا گناہ سمجھتا ہوں —— (اس پر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوتے) میں جانتا ہوں کہ یہ غریب ہندوستانیوں کی حق تلفی ہے (پھر نعرے بلند ہوتے) اور میں جانتا ہوں کہ اس طرح میں اپنے ہندوستانی بھائیوں کے منہ سے روکھی سوکھی روٹی کا بھی نوالہ چھین رہا ہوں (اس پر دیر تک فلک شگاف نعرے بلند ہوتے)۔

پھر ہم حاضرین جلسہ کو حفظان صحت کے اصول بتاتے اور ساتھ ہی ساتھ امور خانہ داری کی بھی تلقین کرتے اس لئے کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا انسان اپنے گھر ہی سے سیکھتا ہے بہرحال حفظان صحت اور امور خانہ داری کے بعد ہم فوراً اپنی تقریر کا رخ کفایت شعاری کی طرف پھیر لیتے اور پھر شعر و شاعری کی طرف اسی سلسلے میں ہم مرزا غالب۔ میر تقی میر۔ میاں نظیر اکبرآبادی اور جناب اکبر الہ آبادی کے زیادہ سے زیادہ شعر حاضرین کو سناتے کہ ہماری تقریر ذرا

طویل ہو جاتی اور حاضرین یہ کہہ سکتے کہ بڑا بولنے والا ہے مگر اس کے باوجود جب ہماری تقریر ۱۵ ہی منٹ میں ختم ہونے لگتی تو ہم اپنے حافظہ پر زور دے کر تمام لطائف جو ہم نے زندگی بھر سنے ہوتے اپنے ان معتقدین کو سناتے اور ہم کو یہ دیکھ کر مسرت ہوتی کہ تمام مجمع ہنسی کے مارے لوٹا جا رہا ہے۔ اب مجمع کی آب و ہوا معتدل کرنے کے لئے ہم علامہ راشد الخیری کی ایک آدھ درد انگیز ناول کا پلاٹ بیان کر جاتے تاکہ ہنسنے والے یہ اندازہ کر سکیں کہ ہم کو صرف ہنسانا ہی نہیں رلانا بھی آتا ہے مگر یہ بھی آخر کب تک ہوتا۔ ہمارے ایسے نامی گرامی لیڈر کو کم سے کم ایک گھنٹہ تقریر کرنا ہوتی لہٰذا ہم اس وقت کو پورا کرنے کے لئے اپنی زندگی کے کچھ واقعات مثلاً اسکول اور کالج کے افسانے یا اپنے مختلف ریل کے سفر میں سے کوئی سفرنامہ سنا جاتے۔ بہر حال ہماری تقریر ان تمام نکات و رموز کے بعد جب ایک گھنٹہ میں ختم ہوتی تو ہم دیکھتے کہ حاضرین کا بہت تھوڑا سا مجمع باقی رہ گیا ہے در اصل یہی پسماندگان ہمارے معتقد ہوتے اور ان ہی کے سبب سے ہماری لیڈری کے آئندہ چلنے کی امید باقی رہ جاتی۔ ہم ان حضرات کے نعرہ ہائے تحسین میں اپنی تقریر ختم کرتے اور اس کے بعد اپنے میزبانوں کے مشورے سے فوراً کسی دوسرے شہر یا گاؤں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اس لئے کہ ہماری تقریر سے بہت سے ہمارے دشمن پیدا ہو جاتے اور وہ ہم کو مسخرا بے تکا۔ یاوہ گو وغیرہ کہہ کر ہماری شان میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھے۔ بہر حال ہم خود اس کا موقع نہ دیتے اور فوراً کسی اور طرف کا رخ کر کے روانہ ہو جاتے ہر جگہ ہماری یہی آؤ بھگت ہوتی اور ہر جگہ ہماری تقریر کی مہارت اور جادو بیانی کا سکہ یوں ہی بیٹھتا اس سے

زیادہ آخر آپ ایک لیڈر سے اور کیا چاہتے ہیں اور ایک لیڈر اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس لیڈری کا اتنا سخت معاوضہ دیا جائے کہ آدمی جیل تک چلا جائے لیڈری کے لئے ہم بس یہی ایثار کر سکتے تھے کہ سوٹ نہ پہنتے، فیشن پرستی کو چھوڑ دیتے۔ اچھی خاصی صورت کو بگاڑ لیتے۔ سوائے لیڈری کے دنیا کا کوئی اور کام نہ کرتے تقریر کی مشق بڑھا لیتے۔ ایڈریس لینا اور ایڈریس کا جواب دینا سیکھ لیتے کسی کے موافق یا کسی کے مخالف پروپیگنڈہ کرنے کے گر معلوم کر لیتے عوام کو معتقد بنانے کے ہتھکنڈے یاد کر لیتے مجمع کو ہنسا دینے اور مجمع کو رلا دینے کی قدرت اپنی تقریر میں پیدا کر لیتے شہر شہر اور گاؤں گاؤں تقریریں کرتے پھرتے اور ان تمام خدمات کے معاوضے میں صرف یہ چاہتے کہ ہم کو لمبے چوڑے توہی خطاب دیئے جاتے۔ اخبارات میں ہمارے چرچے ہوتے گھر گھر ہمارا تذکرہ ہوتا۔ ہماری تصاویر کو لوگ قدر و منزلت کے ساتھ دیکھتے جب ہم گھر سے باہر نکلتے تو لوگ سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہمارا نام لے کر نعرے بلند کئے جاتے اور وہی تمام اعزاز ہم کو حاصل ہوتا جو ایک لیڈر کو حاصل ہونا چاہئے۔ رہ گیا یہ سوال کہ ہم کھاتے کیا اور ذریعہ معاش کیا ہوتا یہ اس لئے خارج از بحث ہے کہ اگر ہم کو لوگ لیڈر سمجھ کر روپے کی تھیلیاں پیش نہ کرتے تو ہم فوراً لیڈری چھوڑ دیتے اس لئے کہ روپیہ کی تھیلیاں پیش نہ کرنا دراصل ہماری توہین ہوتی اور ہم اس توہین کو ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور بغیر اس کے تو شاید ہم کو گھر سے بھی لیڈری کرنے کی

اجازت نہ ملتی۔ لیڈری کرتے تو کیوں اگر یہ سچ ہے کہ ایک لیڈر کے لئے کسی
وقت بھی کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی کمی نہیں رہتی اس لئے کہ اول تو
وہ ساگ پات قسم کی غذا کھاتا اور کھدر قسم کا لباس پہنتا ہے دوسرے
اس کے معتقدین ہر وقت اس کو اپنے لئے باعث اعزاز سمجھتے ہیں کہ ان کا رہنما
ان کے دسترخوان کو عزت عطا کرے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ رہنما غریب کے
بال بچے بھی ہوتے ہیں اور وہ بغیر پیش کردہ تھیلوں کے زندہ رہ ہی نہیں سکتے
رہنما اپنی زندگی تو بڑے مزے میں گزار سکتا ہے بشرطیکہ وہ مرنے کے بعد کچھ
جائداد اپنے پسماندگان کے لئے چھوڑ جانے کا گھریلو طور پر پابند نہ بنا دیا گیا ہو
ایسی صورت میں ہمارے لئے تو تھیلیاں از بس ضروری ہوتیں۔ ایسی ضروری
کہ شاید ہم اپنی لیڈری کی پہلی شرط انھیں تھیلیوں کو قرار دے دیتے تاکہ ہمارے
بعد ہمارے بچوں کو لیڈر وغیرہ بننے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

بہرحال یہ تمام مرحلے تو کسی نہ کسی طرح طے ہو ہی جاتے مگر ہم نے ان لیڈروں
کی زندگی میں ایسے ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں کہ ان کی ناک میں دم ہو جایا
کرتا ہے اور وہ عجیب عجیب ترکیبوں سے ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں مثلاً
اپنے ہی معتقدین میں کسی وجہ سے اختلاف ہو جائے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم
ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہو جائیں جلسوں میں
ایک دوسرے پر شرم شرم کے نعرے بلند کرتے کرتے یہ لوگ ڈھیلے
بازی سے جو ابتدا کرتے ہیں تو اکثر پولیس کی فائرنگ پر ایسے جلسوں کی
انتہا ہوا کرتی ہے ایسی صورت میں لیڈر غریب کے لئے یہ بڑی مصیبت

ہوتی ہے کہ وہ کس کا ساتھ دے کس کا نہ دے۔ یہ مصیبت بہ حیثیت ایک لیڈر کے ہم پر بھی نازل ہوتی مگر ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اس قسم کے مواقع پر ہم ہمیشہ دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا لیا کرتے ہیں یا دروازے کے اوپر ایک تختی ٹانگ دیا کرتے ہیں کہ۔

مکان برائے کرایہ خالی ہے

یا سر پر پٹی باندھ کر لحاف کے اندر گھس رہتے بہرحال کچھ بھی کرتے مگر صاحب ہم سے تو یہ نہ ہوتا کہ ان ہنگاموں میں گھر کے باہر نکلتے اور بچوں سے کہہ جاتے کہ تم اپنے یتیم ہونے کا انتظار کرو یا گھر سے نکل کر لٹھوں کے زیر سایہ اسپتال پہونچ کر پھٹے ہوئے سر پر ٹانکے لگوا دے اس قسم کے معرکوں میں ہماری لیڈری ہمیشہ ڈاکٹری سرٹیفکٹ داخل کر کے رخصت علالت لے لیا کرتی اور ہم ان باتوں سے ہمیشہ دور رہتے اسی طرح ان معرکوں میں بھی ہم سب کی نگرانی کے لئے پیچھے ہی رہتے جس میں پولیس وغیرہ سے کوئی مقابلہ ہو جاتا تاکہ ہمارے پیر دبھاگنے نہ پائیں۔ اس قسم کے موقعوں پر ایک سمجھدار لیڈر ہمیشہ پیچھے ہی رہے گا۔ البتہ بھاگنے والوں میں لیڈر کو سب سے آگے رہنا چاہئے اور یہی ہم بھی کرتے تاکہ بھاگنے کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کر سکیں اور در اصل یہی وقت بھی ہوتا ہے۔ رہنمائی کرنے کا اول تو جہاں تک ہم سے ہو سکتا اس قسم کے مواقع پیدا ہی نہ ہونے دیتے کہ جان جوکھم میں پڑ جائے۔ اور جینے کے لالے۔ لیکن اگر ناگہانی طریقہ پر اس قسم کا کوئی موقع آجاتا تو ہم سب سے پہلے اپنی خیر مناتے اس لئے کہ اگر ہم ہی نہ ہوتے تو ہمارے پیرو زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ ہماری زندگی خود ہم کو اپنے لئے عزیز نہ ہوتی

بلکہ اگر سچ پوچھیے تو ملک وقوم کے لئے عزیز ہوتی اور ہم زندہ رہنا محض
اس لئے گوارا کر لیتے کہ ہماری ضرورت ہماری قوم کو ہوتی ورنہ آپ جانتے
ہیں کہ ہمارا ایسا لیڈر بھلا موت سے کیا ڈرتا مگر چونکہ ہم لیڈر رہتے لہذا
اس قسم کی موت سے نہ ڈرنا ہی بُرا سمجھتے اور اپنے کو اپنی قوم کی امانت سمجھ کر
جہاں تک ہو سکتا محفوظ رکھتے۔

مناظرہ انجمن بہار ادب لکھنؤ ۳۸ء

لکھنؤ اور غیر لکھنؤ اسکول کی شاعری کا وہ دور جس کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے فنی جذباتی اور افادی حیثیت سے ادب اردو میں کیا درجہ رکھتا ہے۔؟

اس سے قبل کہ میں مقررہ ادبی عنوان پر کچھ عرض کروں امید ہے کہ آپ مجھ کو اجازت دیں گے کہ میں ذرا اپنی جغرافیائی حیثیت بیان کردوں تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ ایک تھانوی کیا ہوتا ہے، اور کیوں ہوتا ہے یعنی ایک تھانوی کو لکھنؤ یا غیر لکھنؤ اسکول کی شاعری کے اس دور میں جس کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا فنی، جذباتی اور افادی حیثیت سے کیا درجہ حاصل ہو سکتا ہے اس کو آپ بغیر جغرافیائی تشریح کے محض علم عروض کی مدد سے شاید نہ سمجھ سکیں البتہ جغرافیہ کے علاوہ اگر کوئی اور علم اس بات کو سمجھا سکتا ہے تو وہ علم ریلوے ہے یعنی ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر آپ کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ تھانہ بھون کہاں واقع ہے لکھنؤ سے وہاں تک

کا کر ایہ کیا ہے اور فنی جذباتی یا افادی حیثیت سے وہاں تک کس درجہ میں جانا
چاہیئے۔ بہر حال تھانہ بھون کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جس کی جستجو میں آپ کو
واسکوڈیگاما بننا پڑے اب تو جب کہ آپ نے ایک تھانوی کو دریافت کر لیا
ہے تھانہ بھون کا آسانی کے ساتھ پتہ چل جانا کوئی بات ہی نہیں آپ کیوں
کسی جغرافیہ کی کتاب کی ورق گردانی کریں اور کیوں ان ڈبلو آر کا ٹائم ٹیبل
خریدنے کے بجائے ای۔ آئی۔ آر کا ٹائم ٹیبل خرید کر اپنے دام ضائع کریں۔ ہم
خود ہی عرض کئے دیتے ہیں کہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں برقی روشنی اور دو
اسٹیشنوں والا ایسا قصبہ ہے جس کو اگر آپ یو۔ پی اور پنجاب کی سرحد کہیں تو غلط
نہ ہوگا۔ یہ قصبہ دہلی سے جتنا قریب ہے لکھنؤ سے اتنا ہی دور ہے اور اسی
اعتبار سے ایک تھانوی کا دہلوی ہو جانا جس قدر آسان ہے اسی قدر لکھنوی
بننا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود زندگی بھر لکھنوی رہنے کے یہ خاکسار آج
تک نرا تھانوی بنا ہے حالانکہ نام کے محض جینے کے لئے تھانوی لگا ہوا ہے
ورنہ در اصل مرنے کے لئے یہ غلام خالص لکھنوی ہے۔ بچپن یہیں گزرا جوانی
اسی عروس البلاد اور بلاد العروس کی گلیوں میں کھوئی اور بدستور یہ سلسلہ
جاری ہے اب امید ہے کہ اگر خدا نخواستہ بڑھاپے کی نوبت آئی تو وہ بھی
یہیں کی مساجد میں وظیفہ پڑھ پڑھ کر گزر جائے گا اور خاک عیش باغ کی
کشش اپنے حدود سے نکلنے نہ دے گی مگر باوجود ان تمام ملکی حقوق کے یہ
خاکسار اب تک غیر ملکی ہے ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول
کی شاعری کے متعلق اس غیر ملکی کو لب کشائی کی جراءت بھی کرنا چاہیئے یا نہیں

مگر اس اجتماع میں بہت سے غیر ملکی اس ملکی بحث میں حصّہ لے چکے ہیں لہذا ایک تھانوی کیوں پیچھے رہ جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے اس وقت تک کے متعلق کچھ عرض کرنا کم سے کم ہمارے بس کی بات نہیں اس لئے کہ اپنی پیدائش سے قبل کے واقعات پر روشنی ڈالنا ہمارے نزدیک کوئی انسانی فعل نہیں کہا جا سکتا پھر ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ پیدا ہوتے ہی ہم نے مشاعروں کی حاضری کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ پہلے تو شفاخانوں کی حاضری کو اپنا معمول بنایا اس کے بعد جب یہ طے کر لیا کہ زندہ ہی رہنا ہے تو اسکول اور کالج کی حاضری کو مشاعروں کی حاضری پر مقدم سمجھا۔ البتہ سنہ ۲۸ء سے مشاعرہ بازی اور مشاعرہ نوازی شروع کی ہے اگر آپ سنہ ۲۸ء سے بیسویں صدی کا آغاز فرض کریں تو المکلف الخدمت سمع خراشی کے لئے حاضر ہے ورنہ ما بخیر شما بسلامت خانہ آباد دولت زیادہ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس دس سال کے اندر جو انقلابات فنی۔ جذباتی اور افادی حیثیتوں سے لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر گزرے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان کو کم سے کم پوری ایک صدی میں گزرنا چاہیئے تھا آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے کہ واقعی دس سال ہیں دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی اور لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری دس سال پہلے کس درجہ میں تھی اور آج کس درجہ میں ہے۔

فنی حیثیت سے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ لکھنؤ اسکول کے شعرا نے بیسویں صدی کے آغاز سے اس وقت تک نہ تو کوئی جدید بحر دریافت کی نہ

عروض میں کوئی اضافہ کیا وہی مفعول فاعلات جو باوا آدم کے وقت سے چلا آیا ہے اب تک قائم ہے اور اسی لکیر کے سب فقیر بنے ہوئے ہیں۔ مقررہ بحروں میں غزلیں کہتے ہیں اور وہ بھی زبان کے خاص اصولوں کے ساتھ نہ کوئی جدید محاورہ نظم کرتے ہیں نہ ان کے اشعار میں کوئی نئی ترکیب ہوتی ہے اور کوئی ایسی بندش جس کو زیر بحث دور کی ایجاد یا اس زمانے کی کسی ایجاد کا پرتو کہا جا سکے یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترقیاں لکھنؤ اسکول کے علاوہ آخر کس اسکول نے کی ہیں اس کا جواب ہم آپ کو لکھنؤ اسکول ہی سے دینگے مگر ذرا حیدرآباد تک ہٹ کر استاد السلطان حضرت جلیل کو آپ لکھنؤ اسکول سے باہر نہیں کہہ سکتے مگر چونکہ وہ حیدرآباد میں ہیں لہذا اپنے کو اس دائرہ سے باہر سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

دل کے شیشے میں تصور نے جو کی صورت کشی
کاپیاں آنکھوں نے بھی لے لیں شبیہ یار کی

دراصل یہ ہونا چاہئے تھی بیسویں صدی کی شاعری یہ کیا کہ اس مشین گن کے دور میں بھی وہی تیر و تفنگ نظم کئے جائیں جواب کسی اسلحہ خانہ میں تو نہیں البتہ عجائب خانوں میں نظر آتے ہیں۔ موٹروں کا زمانہ ہے اور اونٹ کا ذکر ہو رہا ہے۔ تار برقی اور ٹیلیفون سے دنیا فائدے اٹھا رہی ہے۔ مگر شاعری کی قسمت میں وہی مرنے کے بعد خط کا جواب لانے والا نامہ بر رہ گیا جو گور غریباں میں آکر چلائے کہ ع

کس کس کو انتظار تھا خط کے جواب کا

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی سائینٹفک شاعری کی مثالیں جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے لکھنؤ اسکول سے باہر بھی مشکل ہی سے ملیں گی مگر سوال تو یہ ہے آخر غزل کیوں کہیئے جب کہ آپ کو یہ معلوم ہو کہ ؎

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

نظم کہیئے نا۔ جس میں آپ ہر اعتبار سے آزاد ہیں۔ نئی نئی بحریں ہوں گی اور نئے محاورے ہوں گے تازہ بتازہ ترکیبیں ہوں گی اور نوبہ نو بندشیں اب دیکھیے نا کہ لکھنؤ اسکول کے علاوہ باقی تمام ہندوستان غزل گوئی چھوڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہو چکا ہے اور ان نظموں میں بھی خوب خوب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں اس وقت کوئی نظم تو یاد نہیں مگر ان نظموں کا سانچہ یاد ہے لہٰذا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

تو برق مجسم ہے

تو بیش ہے تو کم ہے

اندازۂ پیہم ہے

خمیازہ بہم ہے

————— اے وہ کہ تو ہی تو ہے

اندازۂ شکیبائی

یہ انجمن آرائی

اے جنت بینائی

اے پربت صد رائی

اے وہ کہ تو ہی تو ہے

مفہوم کی جستجو نہ کیجیے، معنی آفرینی سے بھی کام نہ لیجیے، ترکیبوں کی صحت پر بھی غور نہ فرمائیے بلکہ یہ دیکھئے کہ کیا روانی ہے اور کیا موسیقیت۔ جوانی پھوٹی پڑتی ہے شباب رقص میں ہے۔ جذبات عریاں ہوئے جاتے ہیں۔ فضائیں زمزمے برسانے لگی ہیں اور ماحول ایک عظیم الشان پیانو نظر آتا ہے کیا اس کو بھی آپ فنی حیثیت سے ترقی نہ کہیں گے؟ خیر یہ تو یہ اب تو ایک اور شاعری شروع ہو گئی ہے جس کو آزاد شاعری کہتے ہیں جس میں ردیف وقافیہ سے آزاد ہو کر شعر کہا جاتا ہے اور ہر شعر مادر پدر آزاد قسم کا ہوتا ہے اس کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو:

میں تری جذبات کی دنیا میں آکر سو گیا
لوریاں دیتی رہی تیری جوانی بار بار
پھر جفاؤں نے تری مجھ کو جگایا رات بھر
تو مری انگڑائیوں کا رقص خود دیکھا کیا
میں نے بیداری میں اپنے خواب دیکھے بارہا
ہاں مگر تو ہی مرے ہر خواب کی تعبیر ہے

ان اشعار کو آپ "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" کہہ کر ہنس دیں گے حالانکہ ان ہی کا نام افکار عالیہ۔ جواہر پارے۔ حسن تخیل اور زمزمہ روح وغیرہ ہے۔

(۱) خیر اس کو بھی جانے دیجیے ہم تو زمانے کی رفتار دیکھ رہے ہیں

کہ عنقریب شاعری صرف اس طرح ہوا کرے گی کہ مشاعروں کے دعوت ناموں میں مصرع طرح کی جگہ یہ لکھ دیا جائے گا کہ "طرح دو انچ تین سینٹی میٹر طویل قافیہ پیمانہ ردیف نہیں" اور اسی طرح پر شعرائے کرام ناپ ناپ کر مصرع کہیں گے اور عروض کے پرانے اوزان کو چھوڑ کر جدید پیمانوں سے ان کے اشعار ناپے جائیں گے بلکہ کیا تعجب ہے کہ امریکہ کے سائنسداں شعر کہنے کی کوئی مشین بنا کر بھیجدیں کہ مصرع طرح اس مشین میں رکھا اور مطلع سے لے کر مقطع تک پوری غزل تیار۔ بہر حال اس سائنس کے دور میں وہ شاعری جو سائنٹفک اصولوں کے خلاف ہو ذرا مشکل سے کامیاب ہو سکتی ہے اور اس کو جھک مار کر کسی نہ کسی انقلاب کی زد میں آنا ہی پڑے گا۔

مگر لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کو ان انقلابات کی بھی خبر نہیں بلکہ لکھنؤ اسکول کے شعراء بیسویں صدی کے کلام کو سن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ اب تک محض غزل ہی کہہ رہے ہیں گویا فنی حیثیت سے کوئی ترقی خود ان کو قبول نہیں کر سکتی البتہ فنی حیثیت کے ایک دوسرے رخ سے ترقی ضرور کی ہے اور وہ ترقی یہ ہے کہ اب تک تو عروض محض مسند اور تکیہ۔ قالین اور دری چاندنی وغیرہ تک محدود تھا مگر اب اس میں کرسیاں بھی شامل کر لی گئی ہیں شمع کی گردش کے بجائے شعرائے کرام ڈائس پر جا کر کلام سنانے کو اب تقطیع سے گرا ہوا نہیں سمجھتے حاضرین مشاعرہ کے تالی بجانے میں اب کوئی ذم کا پہلو نہیں نکلتا۔ حقہ کی جگہ سگار اور سگریٹ میں بھی تنافر نہیں پایا جاتا۔ دور کے بجائے اگر شعراء کو حروف تہجی کے اصول پر مرتب کی ہوئی

فہرست سے پڑھوا لیا جائے تو اس میں بھی خفی یا جلی کسی قسم کا الیطا نہیں ہوتا مختصر یہ کہ لکھنؤ اسکول کی ان ترقیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ جب ان فنی ترقیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ جب ان فنی ترقیوں کو اس فنی جمود کے دوش بدوش آپ رکھیں گے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس وقت تک لکھنؤ اسکول کی شاعری کو فنی اعتبار سے ڈیوڑھا درجہ حاصل ہے۔

اب رہ گئیں وہ حیثیتیں جذباتی اور افادی جہاں تک جذباتی حیثیت کا تعلق ہے ہمارے خیال میں یہ سوال اس وقت پیدا ہی نہیں ہوتا جب تک کہ لکھنؤ اسکول کے شعراء شاعروں کی مقررہ طرح پر غزل کہنے کے عادی ہیں مقررہ طرح مقررہ قواعد پر غزل کہنا کس طرح جذباتی شاعری ہو سکتی ہے قافیہ پیمائی کو جذباتی شاعری نہیں کہا جا سکتا جذباتی شاعری تو دراصل یہ ہے کہ طرح تو ہے ویسی

ذرہ ذرہ ترے کوچہ کا مرا دل ہو جائے

اور جذبات سے مغلوب ہو کر شاعر یہ مطلع کہہ جائے کہ ؎

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

جذبات کو ردیف کی بیڑیاں اور قوافی کی ہتھکڑیاں پہنا کر آپ قید نہیں کر سکتے۔

(۲) اور نہ جذبات دراصل اس کے پابند ہو سکتے ہیں کہ وہ آپ کے خیالات

فاعلات کے حرف بحرف پابند رہیں بلکہ اگر سچ پوچھیے تو جذبات اس کی کبھی پروا نہ کریں گے کہ آپ کہاں پر موزوں رہے اور کہاں ناموزوں ہو گئے۔ جذباتی شاعری تو در اصل یہ ہے کہ ؎

تم تو کہتے تھے وہ آئیں گے نہیں

دیکھو وہ کیا چلے آتے ہیں دونوں ہاتھوں میں پر طاؤس لئے

آپ کے نزدیک یہ شعر یقیناً غلط ہوگا اور ہر اعتبار سے غلط ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی آپ کے اصول کے مطابق یہ شعر ذرا غلط ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جذباتی شعر ہے اگر آپ یہ کہیں کہ پہلا مصرعہ بہت چھوٹا اور دوسرا مصرعہ بہت بڑا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہی تو در اصل جذباتی شعر ہونے کی علامت ہے شاعر جس وقت پہلا مصرعہ کہہ رہا تھا اس کے جذبات اسی قدر مختصر تھے جس قدر مصرعہ مختصر ہے اور جس وقت دوسرا مصرعہ نظم کیا گیا ہے اس وقت اس کے جذبات کا طول وہی تھا جو دوسرے مصرعہ میں آپ کو نظر آرہا ہے۔ در اصل شاعر نے عروض سے زیادہ اپنے جذبات کی پابندی کی ہے اور ہمارے نزدیک یہی جذباتی شاعر ہے - یا ایک اور شعر یاد آیا ؎

سر سے پا تک ہے کمر ان کی جو بل کھائی ہوئی

وہ نسلاً بعد نسلاً لاولد ہوتے رہے

آپ اس شعر پر ہنس رہے ہیں اور آپ کی ہنسی ایک حد تک حق بجانب بھی ہے مگر اس کا کیا علاج کہ جذبات در اصل کسی کی موزونیت یا کسی

ترتیب کے پابند ہو ہی نہیں سکتے ۔ اس شعر میں تو خیر بے ربطی اور ناموزونیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے مگر ہم تو اس کو بھی مکمل جذباتی شعر کہنے کو تیار ہیں جس کا پہلا مصرعہ لفظ میں ہو اور دوسرے مصرعہ کی جگہ محض مفہوم نثر میں لکھ دیا جائے مطلب کہنے کا یہ کہ جذبات کو آپ قید نہیں کر سکتے اور جب آپ نے قید کر دیا تو جذبات بھی آپ کو وہ دھوکا دیں گے کہ آپ سمجھیں گے ان کو جذبات حالانکہ وہ ہوں گے محض مصرع طرح کے سائز کے شعر اور آپ کی موزونیت کے چند کرتب مطلب کہنے کا یہ ہے کہ جذباتی حیثیت سے تو لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری کو کوئی درجہ ہی نہیں دیا جا سکتا اس لئے کہ بقول گاندھی جی کے کوئی فورتھ کلاس ہی نہیں ہے جس میں سفر کروں لہذا مجبوراً تھرڈ کلاس میں بیٹھ جاتا ہوں ۔

افادی حیثیت سے البتہ لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری نے حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں مثلاً سب سے پہلی ترقی تو کرسیوں کی نشست ہے جس کا افادی پہلو یہ ہے کہ حاضرین کے جوتے محفوظ رہ سکتے ہیں حالانکہ چوروں کے نقطۂ نظر سے افادی پہلو ختم ہو گیا مگر حاضرین مشاعرہ کے نقطۂ نظر سے افادی پہلو دراصل اب پیدا ہوا ہے یعنی اب جوتوں کی چوری کا محض اس وقت امکان ہے جب آپ پاپوش کے ساتھ صاحب پاپوش کو بھی غائب کریں ورنہ آنکھ سے سرمہ چرانا اور پیر سے جوتا کھول لے جانا تقریباً یکساں ہے دوسرا افادی پہلو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے سامعین مشاعرہ سوٹ پہننے لگے ہیں اور ان کے قیمتی سوٹ فرشی مشاعرہ میں اگر بالکل خراب نہ ہوں تو کم از کم پتلون کو تو شرعی پاجامہ ضرور بنا دیتے ہیں اور ان کی نشست کا زاویہ بھی

کچھ بے ڈھنگا ہی سا رہتا ہے اسی وجہ سے بہت سے سامعین سوٹ کی وجہ سے نماز کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی شرکت بھی چھوڑتے جاتے تھے۔ کہ کرسیوں کی نشست کا طریقہ معلوم ہو گیا اور اب ان سامعین کے سوٹ بالکل اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح سنیما میں محفوظ رہ سکتے ہیں یہ افادی پہلو بظاہر تو کچھ نہیں مگر اہل سوٹ کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے تو بہت کچھ ہے۔

تیسرا افادی پہلو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس وقت تک کے چند مایۂ ناز شعراء، مثلاً خیام العصر ریاض خیرآبادی، لسان القوم مولانا صفی اور حضرت ظریف لکھنوی کے کلام کا مجموعہ شائع نہیں کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ادب اردو کے ان گم شدہ اوراق کی ضرورت نہایت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے مگر اقتصادی تباہی کے اس دور میں اگر یہ مجموعے شائع کر دیئے جائیں تو قدردانان سخن اپنا پیٹ کاٹ کر ان کو خریدیں گے اور افادی مقصد فوت ہو جائے گا۔

چوتھا سب سے بڑا افادی پہلو یہ ہے کہ فرشی مشاعروں میں ہر آنے والے شاعر کو شعراء سے لے کر سامعین تک جن مختلف زاویوں سے اٹھ اٹھ کر اور بیٹھ بیٹھ کر تعظیم دیا کرتے تھے اس سے پتلون تو پتلون اگر سچ پوچھئے تو پاجامہ تک کی سیونیں بعض اوقات چرچرا جاتی ہیں اور تعظیم دینے والے کو کان پکڑ کر اٹھا بیٹھی کا مزہ آجاتا تھا اب اس کا بھی سدباب ہو گیا ہے اور کسی کو تعظیم دینے کے لئے صرف دو ہی زاویے باقی رہ گئے ہیں یعنی یا تو بخط مستقیم کھڑے ہو جائیں ورنہ زاویہ قائمہ بنے ہوئے بیٹھے رہیں۔ بلکہ پیروں کو زحمت دینے

بجز فنی علم

کے بجائے اظہارِ عقیدت کے لئے اب ہاتھوں سے کام لیا جاتا ہے کہ جس کو آسمان پر چڑھانا چاہا تالیاں بجادیں اور بس نہ کھڑا ہونا، نہ بیٹھنا نہ ہاتھ جوڑنا نہ فرشی سلام کرنا اس میں شک نہیں کہ اس طرح ورزش کا ایک بہانہ ختم ہو گیا مگر ایک بہت بڑا افادی پہلو ضرور نکل آیا۔

فنی، جذباتی اور افادی تین حیثیتیں تو ختم ہو گئیں رہ گئیں باقی حیثیتیں وہ خارج از بحث ہیں۔ لہٰذا زیادہ حدِ ادب۔

بزرگ قاسم

غالبیات

مرزا غالب کے ایسے مسلم الثبوت استاد نے جو غزل ہفتوں کی کاوش کے بعد کہی ہوگی اس کی شرح یہ خاکسار محض چند صفحوں میں عرض کر رہا ہے جس کے لکھنے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ صرف نہ ہوا ہوگا۔

اس سے قبل کہ شرح پیش کی جائے ضرورت اس کی ہے کہ ہم اخلاق و شرافت کے نام پر معذرت خواہی کریں تاکہ حشر کے دن دوسرے گریبان پکڑنے والوں میں مرزا غالب ایسے بزرگ نہ ہوں لہذا سب سے پہلے معذرت ضروری ہے ملاحظہ فرمائیے اور گواہ رہئے کہ ہم معذرت خواہ ہو چکے تھے۔

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہ تھی انھیں
کچھ شرح لکھنا باعث عزت نہیں مجھے
آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہی صلح کل
غالب سے کیا کسی سے عداوت نہیں مجھے

میں شرح لکھ رہا ہوں شوکتؔ کچھ یہ کم نہیں
مانا، اسدؔ کا مرتبہ شوکت نہیں مجھے

غالبؔ یہ اور مجھ کو ہو تنقید کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

میرا مزاج آپ ہے جامِ جہاں نما
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں اور شرح لکھتا، مگر اس سے مدعا
بجز ارتکابِ خود ظرافت نہیں مجھے

یوں ہی سا اک مذاق تھا جو شرح بن گیا
دیکھا کہ چارہ غیر اشاعت نہیں مجھے

اس میں جو آ پڑی ہو سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے ترکِ عقیدت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

حرکت تو یہ بڑی ہے یہ نیت بری نہیں!
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا شوکتؔ خدا گواہ
سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے

اس معذرت کے بعد معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک بار سر سے اتر گیا اور اب

شرح پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا لہٰذا ملاحظہ فرمائیے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

دھمکی سے مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک رنگروٹ فوج میں بھرتی ہونے کے لئے پہنچا صاحب نے اس کو فوج کی ملازمت کے نشیب و فراز سمجھا کر اس کی جرأت کا امتحان لینا چاہا اور ریوالور اس کے کوٹ کی آستین میں رکھ کر لبلبی دبا دی ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ گولی کوٹ کی آستین کو پار کر گئی مگر یہ جوان اٹینشن رہا صاحب نے اس کی یہ جرأت دیکھ کر فوراً پروانہ تقرر دے دیا اور ساتھ ہی کچھ روپیہ دیا کہ اس کا کوٹ بنوالو تمہارا کوٹ خراب ہو گیا ہے ــــ رنگروٹ نے کہا اور حضور۔ پتلون کے دام ــ صاحب نے کہا پتلون کیسا؟ ــــ رنگروٹ نے نہایت سادگی سے کہا۔ حضور وہ بھی تو خراب ہوگیا ہے ــــ اسی مضمون کو مرزا صاحب نے اپنے اس مطلع میں پیش کیا ہے کہ عشق کی جنگ جوئی کے لئے پتلون کے دام مانگنے والوں کی ضرورت نہیں بلکہ ان مردوں کی ضرورت ہے جو عشق و محبت کی نبرد آزمائی میں جنرل فرانکو ثابت ہوں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے کے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

اس شعر میں صرف ایک لفظ ”کھٹکا“ ایسا ہے جس نے شعر کو ذرا

پڑھے لکھوں کے سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے حالانکہ اگر اسی لفظ کو بدل کر یہ شعر یوں کہہ دیا جاتا تو کسی شرح کی ضرورت نہ تھی ؎

تھا زندگی میں موت کا پرزہ لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

یعنی موت کے بعد انسان کا رنگ زرد ہوتا ہے مگر میں نے زندگی ہی میں موت کا ایسا پرزہ فٹ کرا لیا اس کی وجہ سے زندگی میں رنگ زرد نظر آتا تھا۔ اور مرنے کے بعد تبدیلی رنگ کے جھگڑے سے نجات مل گئی اب اس قسم کے پرزے شاید نہیں ملتے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندستان میں اس قسم کے باکمال انجینیر بھی تھے جو ایسے حیرت انگیز پرزے اور کھٹکے بنا لیا کرتے تھے دوسرا شعر یوں ہے۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یہ شعر وہ ہے جس کا ایک عام فہم ایڈیشن کسی نو بہ انگری شاعر نے پیش کیا ہے کہ ؎

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

یعنی بچے کے پیر پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ میں ابھی کمسن ہی تھا اور خیالات میں کوئی شعور بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ مجھ کو وفا کے طریقے سمجھنے اور وفا کیش بننے کا شوق پیدا ہو گیا اور عقل کی خامی کے زمانے میں بلوغ

کی یہ علامت پیدا ہو چکی تھیں اور سنیئے فرماتے ہیں ؎

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

اس شعر کو سمجھنے کے لئے ممکن ہے آپ اٹیلس دیکھنا شروع کر دیں کہ دنیا کے نقشے میں دریائے خون کہاں ہے مگر اس جستجو میں آپ کو کامیابی نہ ہو گی بلکہ اس شعر کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دل اور جگر کو اسپین کے دو پرفضا مقامات تصور کر لیجئے اس کے بعد اسپین کی خونچکاں اور تباہ کن خانہ جنگی کو پیش نظر رکھ کر اس شعر کا مفہوم سمجھئے کہ اسپین کے ان دو مقامات کے درمیان جہاں آج خون کی موجیں نظر آتی ہیں پہلے وہ دل فریب منظر تھا کہ جلوۂ گل بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتا تھا شعر سنیئے کیا خوب کہا ہے ؎

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

اس شعر میں جو مضمون مرزا صاحب نے پیش کیا ہے وہ اب تک پیدا ہونے والے تمام شعراء اپنے اپنے الفاظ میں کہہ چکے ہیں اور آئندہ آنے والے شعراء اس بات کا حلف وفاداری اٹھا رہے ہیں کہ اسی تخیل کو اپنے الفاظ میں ضرور ادا کریں گے خواہ پھر اس کو سرقہ سمجھا جائے یا اخلاقاً توارد کہہ دیں ۔

بہر حال اس شعر کو وہ حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو بھوت پریت اور آسیب وغیرہ کے قائل ہیں ـــ شاعر نے یہی کہا ہے کہ عشق وہ بلا ہے جو کبھی

پیچھا نہیں چھوڑتی چنانچہ سینہ سے نکل تو جاتا ہے مگر دل کا درد بھوت بن کر کراہتا ہے اور وہی اس آسیبی خلل کی صورت رکھتا ہے جس کو عرف عام میں عشق کہتے ہیں اس سلسلہ میں کسی متروک شاعر کا ایک شعر یاد آ گیا ملاحظہ ہو ؎

یہ محبت بھی کہیں اے بندہ پرور جائے ہے
جائے بھی ہے یہ تو عاشق کو مٹا کر جائے ہے

مگر ہمارا تو خیال یہ ہے کہ پہلے تو محبت کا بھوت عاشق پر سوار رہتا ہے اور جب عاشق بقول شاعر کے مٹ جاتا ہے تو وہ خود بھوت بن کر شاعروں اور افسانہ نگاروں پر سوار ہو جاتا ہے مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے بھوت مورخین کے سر پہ بھی سوار ہوئے ہیں۔ مقطع کے علاوہ آخری شعر بھی کیا خوب ہے ؎

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

احباب نے دیکھا کہ بیچارہ جنگلوں کی خاک اڑاتا پھرتا ہے دامن گریباں میں ہے اور گریباں دامن کے اشتراک عمل سے لنگوٹی کی قائم مقامی کے لئے تیاریاں کر رہا ہے۔ خط بڑھا ہوا ہے۔ ناخن البتہ جدید فیشن کے مطابق لمبے لمبے ہیں۔ پریشاں بالوں پر ایک دوسرا بیاباں نشو و نما حاصل کر رہا ہے سر کیا ہے جوؤں کی دنیا کا گلوب ہے۔ ڈاروں کی بندر والی تھیوری میں انقلاب ہوا ہے اور اب معلوم ہوا ہے کہ انسان خواہ پہلے بندر رہا ہو یا لنگور مگر اس کا مستقبل یہ ہے کہ اگر عشق ہو گیا۔ اور عشق نے جنون کی کیفیت پیدا کی تو وہ کچھ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بہرحال دوست کا یہ حال دیکھ کر احباب دوستی یہی کر سکتے تھے کہ اس کو پکڑ کر جیل بھجوا دیں۔ دوستی کی یہ شان بظاہر دشمنی نظر آتی ہے مگر بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا علاج ہی یہ ہے کہ دوا کے بجائے زہر دیا جائے اسی قسم کے علاج بالمثل میں سے ایک علاج یہ بھی ہے کہ احباب جنگل سے اپنے سر پھرے دوست کو پکڑ لائے اور جیل میں بند کر دیا تاکہ اس کا تحفظ ہو سکے اور وہ جنگلوں کی خاک نہ اڑائے مگر اس کا کیا علاج کہ آپ زنداں میں بیٹھے ہیں۔ اور خیال ہے کہ بیاباں کی خاک اڑا رہے ہیں مگر اس خیالی بیاباں نوردی کے مضرت رساں تمام اثرات بھی خیالی ہی ہو سکتے ہیں مگر عالم تصور میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک جھاڑی سے ہم اور دوسری جھاڑی سے ایک شیر نکلا۔ ہم ٹھہرے عاشق اور وہ بھی وحشی ہمارے لئے شیر ہو یا بھیڑ سب برابر ہیں۔ لہٰذا اس کو بھی اپنا محبوب سمجھ کر اس کی دم پر گندھی ہوئی چوٹی کا گمان کر کے جو ذرا چھوا تو اس قاتل نے جفا کاریاں شروع کر دیں۔ اور صرف نگاہوں کے تیر یا ابرو کے شمشیر سے زخمی ہی نہیں کیا بلکہ اپنے دست ناز سے پسلیاں چیر کر دل نکال لیا اور کھا گیا عاشق زار کو محض منہ کا مزہ بدلنے کے لئے۔ خیالی بیاباں نوردی کا یہ خیالی واقعہ اگر خیالی نہ ہوتا بلکہ سچ مچ ایسا ہی ہوا ہوتا تو کس قدر افسوس کا مقام تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وحشی دوست کو زنداں میں رکھ کر خیالی صحرا نوردی سے باز نہیں رکھا جا سکتا مگر یہی کیا کم ہے کہ اس سلسلہ کے تمام افسوسناک واقعات بھی خیالی ہی ہوتے ہیں اب مقطع سنئیے اور ایک آہ بھر کر ذرا جھوم تو جائیے یا سر دھنیے یا کم سے کم

زانو تو پیٹ ہی سمجھئے۔

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آجکل آزادی کا مفہوم نئی روشنی کے مردوں اور عورتوں سب نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ آفتابی غسل ہوا کریں۔ مغربی ممالک میں تو بحالی صحت اور انحطاط غیرت وحمیت کے لئے اس قسم کے بہت سے کلب قائم ہیں۔ جن میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ لباس ایک قطعاً غیر ضروری اور غیر فطری چیز ہے۔ اور بغیر اس کے انسان زیادہ خوش، زیادہ بشاش، زیادہ ہلکا پھلکا زیادہ آزاد اور زیادہ نظر فریب رہنے کے علاوہ اخلاقی طور پر زیادہ مضبوط رہ سکتا ہے۔ اس کے دلائل بے شمار پیش کئے جاتے ہیں اور اگر انسان ان کے جوابی دلائل پر غور کرنے کی بجائے تھوڑی دیر بھی نہ سوچے تو یقیناً وہ بھی جامہ سے باہر ہو سکتا ہے خواہ کیسا ہی مقدس اور ستر پوش قسم کا انسان کیوں نہ ہو کہا جاتا ہے کہ لباس اگر کوئی ضروری چیز ہوتا تو انسان ماں کے پیٹ سے سوٹ پہنے ہوئے پیدا ہوتا مگر چونکہ انسان کے لئے فطرت نے عریانی ہی کو لباس بنایا ہے۔ لہٰذا انسان اگر برہنہ رہے تو اسکی زندگی ہر اعتبار سے پاکیزہ بن سکتی ہے اور ہر جھگڑے سے پاک ہو کر انسان اپنی زندگی بسر کر سکتا ہے نہ اس کی فکر کہ اس رنگ کے کوٹ پر اس رنگ کا پتلون پہننا جائز ہے اور اس قسم کا پتلون پہننا حرام مطلق۔ دن کے وقت اس قسم کی ٹوپی پہننا عین سعادت مندی ہے اور رات کے وقت

یہی سعادت مندی انتہائی نالائقی ہو جاتی ہے. اس طرح کی ٹائی اس قسم کی قمیض پر باندھنا بغاوت ہے. اور اس قسم کی باندھنا عین وفاداری. اس طرح کے سوٹ پر اس قسم کا جوتا ہونا چاہئے اور اس طرح کے جوتے کے اندر اس قسم کے موزے ہوں. کھانے کا کپڑا یہ ہے. اور ناچنے کا یہ. ڈنر کے جوتے یہ ہیں اور عام طور پر پہننے کے یہ ٹینس کھیلنے کی شرط یہ ہے اور یہ گھوڑے پر بیٹھنے کا جامہ مختصر یہ کہ ایک اچھا خاصا عذاب ہے اور تحریک عریانی کے مبلغین اسکو عذاب ہی ثابت بھی کرتے ہیں ان کا دعوے یہ ہے کہ جب تک حضرت آدم نے دانۂ گندم استعمال نہ کیا تھا لباس کی ضرورت پیش نہ آئی تھی بلکہ وہ نہایت معصومانہ انداز سے اللہ کے نیک بندوں کی طرح برہنہ پھرتے تھے مگر انھوں نے شیطان کے بہکانے سے شجر ممنوعہ کو خدا کے حکم کے خلاف چھوا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جنت سے نکالے گئے بلکہ بطور عذاب ان پر لباس بھی لاد دیا گیا. اور یہی لباس ایک مستقل جیل کی طرح ہر اولاد آدم کو گھیرے ہوئے ہے گویا لباس وہ جیل ہے جس کو ہم اوڑھے ہوئے اور لپٹائے ہوئے طرح طرح سے سجا کر اور خوشنما بنا کر اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں. اگر حضرت آدم نے گیہوں نہ کھایا ہوتا تو آج ہم کو بزاز. درزی. دھوبی کے جھگڑوں سے نجات مل جاتی اور اس سوٹ بوٹ کے بکھیڑے میں ہم نہ پھنستے مگر اب متمدن ممالک کے مہذب اور روشن خیال باشندے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ باپ کے گناہ کا ذمہ دار بیٹا ہو اور اس کو بھی والد مرحوم کے گناہ کی پاداش میں سزا بھگتنا پڑے لہٰذا وہ اس زنجیر اسیری کو توڑ کر اب جامہ

اور پاجامہ سب سے باہر ہوتے جاتے ہیں اور وہ زمانہ دور نہیں جب تمام مہذب انسان مادرزاد برہنہ نظر آئیں گے۔ اور وحشت اور بربریت کی علامت وہ لباس ہوگا جو آج تہذیب اور تمدن کا علمبردار بنا ہوا ہے

بہر صورت یہ بحث طویل ہے مگر مرزا غالب کے اس مقطع کو دیکھکر یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ اگلے زمانہ میں بھی عریانی آزادی کی علامت تھی اور جس جدت پر آج مغرب کو ناز ہے کہ ہم ہی نے عریانی کی ابتدا کی ہے وہ دراصل ہندوستان کا ایک پرانا رواج ہے چنانچہ مرزا غالب کا یہ مقطع شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی لاش کو بے کفن رکھا گیا ہے۔ کسی مجبوری یا مصیبت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ یعنی زندگی یوں ہی آزادی میں گذاردی غالباً آزادی سے مراد یہی آفتابی غسل وغیرہ ہے یا یہ کہ مرزا صاحب بھی اس سزا کے قائل نہ تھے جو خود ان کے کسی جرم کے سلسلے میں نہیں بلکہ ان کے مورث اعلیٰ کی پہلی غلطی کے سلسلہ میں ان پر عائد کی گئی تھی۔

بہر صورت لاش کا مرنے کے بعد بے کفن ہونا تو خیر وضعداری کی انتہا ہے مگر لاش کے اس طرح عریاں ہونے سے پہلے مصرعہ کی آزادی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ غالباً کسی عریاں تشریح کی محتاج نہیں۔ پھر یہ کہ "حق مغفرت کرے" کہنے کی ضرورت بھی اس لئے پیش آئی ہے کہ مرزا نے اس اسیری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جو اولاد آدم پر نسلاً بعد نسلٍ عائد چلی آئی ہے۔ اگر یہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی تھی تو خدا مغفرت کرے بہر حال وہ تو آزاد مرد تھا اور عجب آزاد مرد تھا۔

شوہر کی جنت

بات یہ ہے۔ کہ ہم نے بیگم کو ہمیشہ اسی بات کا یقین دلایا ہے کہ ہم کو کسی اور جنت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہماری جنت تو صرف آپ کی ذات ہے مگر واقعات اس کے سراسر خلاف ہیں جب کہ ہم کو تو مستقل طور پر یہ فکر ہے کہ اگر جنت میں ہمارا ساتھ ان ہی نیکبخت کا رہا تو آخر کیا ہوگا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

طالب علمی کے زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس کی زندگی بسر کرنے کا ہم کو پورا تجربہ ہے مگر قسم لے لیجیے جو بورڈنگ ہاؤس کے ایک قانون کو بھی صحیح سالم چھوڑا ہو اسکول میں ماسٹروں سے مرعوب ہونا ہمارے نزدیک ہمیشہ ذلت کی بات تھی۔ البتہ ذرا ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھنٹہ میں تھوڑی دیر کے لئے دم سادھ کر بیٹھنا پڑتا تھا مگر اب تو یہ حال ہے کہ گویا ہیڈ ماسٹر صاحب ہی سے شادی کر لی ہے کیا مجال کہ بیگم صاحبہ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے پیدائشی حق یعنی آزادی سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکیں صبح دیر میں سو کر اٹھیں تو منحوس۔ منہ دھوئے بغیر چائے پی لیں تو اچھوت

دفتر دیر سے جانے کا ارادہ کریں تو کام چور، نوالہ حاضر۔ جاڑے کا زمانہ اگر بغیر غسل کے ٹالنا چاہیں تو افیونی۔ تاش کھیلیں تو جواری، شطرنج سے دل بہلائیں تو نحوست کے ذمہ دار۔ باہر گھومنے جائیں تو آوارہ گرد رات دیر میں لوٹ کر آئیں تو اعلیٰ درجہ کے بدمعاش۔ پتنگ اڑانے کا ارادہ کریں تو نوفر۔ اور اگر کچھ بھی نہ کریں یعنی خاموش بیٹھ کر اونگھیں یا منھ اٹھائے محض بیٹھے رہیں تو بیوقوف۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ زندگی ایک شوہر کی زندگی ہے یا کالے پانی کی سزا پانے والے کسی مجرم کی زندگی۔ مگر جیسی کچھ بھی زندگی ہے۔ بہرحال اب تو اسی طرح اس کو بسر کرنا ہے اس لئے کہ بیگم صاحبہ کا ساتھ کوئی ایک دو دن کا تو ہے نہیں بلکہ زندگی بھر کا ساتھ ہے اور زندگی ایک اتنی بڑی مدت کا نام ہے کہ اس کا تصور کرتے ہوئے بھی اختلاج ہونے لگتا ہے۔

خیر یہ زندگی تو جس طرح بسر ہو رہی ہے ہوہی رہی ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ جنت میں کیا ہوگا۔ یعنی اگر ایک یتیم شوہر یہ تمام زیادتیاں کرنے کے باوجود بیگم بھی اسی جنت میں گئیں جہاں ہمارا جانا اس جہنمی زندگی بسر کرنے کے بعد گویا یقینی ہے تو وہاں کیا ہوگا۔ اور وہاں سے کیونکر ہم کو نجات مل سکے گی مگر جہاں تک ہمارا خیال ہے ہماری جنت یقیناً ان خطرات سے پاک ہوگی۔ اور وہاں بیگم صاحبہ ہم کو اپنا شوہر بنا کر یوں نہ رکھ سکیں گی بلکہ وہاں ہم ٹانگیں پھیلا کر دن چڑھے تک سویا کریں گے آفتاب کی شعاعیں ہمارے لحاف پر کھیلا کریں گی۔ مگر بیگم کی یہ مجال نہ ہوگی کہ لحاف

گھسیٹ کر ہمارے کسی خواب کو نامکمل چھوڑ دیں اور ہم کو اندھیرے منھ
نو دس بجے دن کو اٹھا کر بٹھا دیں ۔ ہمارا جب تک جی چاہے گا سویا
کریں گے چاہے ہفتوں سوتے رہیں یا مہینوں سو کر نہ اٹھیں پھر یہ بھی کوئی
ضروری بات نہ ہوگی ۔ کہ سو کر اٹھے تو منھ بھی دھوئیں ورنہ چاء نہ ملے
گی یہ تمام پابندیاں تو اس بیگم والی دنیا اور شوہرانہ زندگی تک ہیں جنت
میں تو ہمارا منھ اپنا ذاتی منھ ہوگا خواہ اس کو دھوئیں یا نہ دھوئیں اور چاء کے
بیچاری کی تو خیر کیا مجال ہے کہ وہ اپنے لئے ہمارا منھ دھلوائے بلکہ جہاں تک
چاء کا تعلق ہے وہ تو سوتے میں بھی ہم پی سکیں گے اس لئے کہ چاء کی خواہش
کو پورا کرنا ہمارا کام نہ ہوگا بلکہ یہ خود چاء کا فرض ہوگا ۔ کہ وہ وقت مقررہ پر ہماری
اس طلب کو پورا کرے یعنی وہ خود ہی ہمارے معدے میں اپنی ذمہ داری کے
ساتھ پہونچا کرے گی مثلاً فرض کر لیجئے کہ ہم سو رہے ہیں تو محض چاء کے
لئے بیدار ہونا اور اپنی نیند میں خلل ڈالنا نہ پڑے گا بلکہ چاء کا فرض ہوگا
کہ وہ خود ہی بے بنجرہ کیتلی سے دم کھاتی ہوئی پیالی میں آئے پھر وہ پیالی
اس چاء کو لے کر ہمارے بستر تک دبے پاؤں آئے گی اور نہایت احتیاط
کے ساتھ لحاف کے اندر پہونچ کر ہمارے لبوں سے لگ جائے گی تاکہ چاء
اس پیالی سے نکل کر ہمارے لبوں سے ہوتی ہوئی آہستہ آہستہ حلق کے نیچے
اتر جائے اور ہم کو خبر بھی نہ ہو ۔ اسی طرح چاء کے ساتھ کا ناشتہ اپنے
فرائض منصبی کو خود ہی محسوس کرے گا ۔ مطلب کہنے کا یہ کہ یہ تو خیر ایک آدھ
مثال تھی جو ہم نے پیش کر دی ورنہ عام طور پر تو یہ ہوگا کہ ہم خود کسی کام کے

نے کبھی مجبور نہ ہوں گے بلکہ ہر کام خود ہمارے لئے جنت میں مجبور ہو گا۔ اور کسی قسم کے کسی قاعدہ یا قانون کی پابندی ہم پر فرض نہ ہو گی بلکہ ہر قاعدہ اور قانون ہمارا پابند ہو گا۔

اب جاڑے کے زمانہ میں نہانے ہی کو لے لیجئے کہ بیگم ناک میں دم رکھتی ہیں۔ اور دسمبر یا جنوری کے زمانہ میں بھی ان کو ذرا بھی ترس نہیں آتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو مر مر کے نہانا پڑتا ہے۔ لیکن جنت میں یہ ظلم ہم پر نہ ہو سکے گا وہاں تو جب ہم چاہیں گے بغیر غسل کئے غسل کی تازگی اپنے اوپر طاری کر لیا کریں گے۔ خواہ وہ دسمبر اور جنوری کا زمانہ ہو یا مئی اور جون کا موسم اور جب یہ صورت ہمارے اختیار میں ہو گی تو اس کے بعد آپ ہی بتائیے کہ بلا وجہ غسل کرنا وقت برباد کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ بیگم ہمارے ان اختیارات کو دیکھیں گی اور تعجب کریں گی۔ اور صرف یہی کیا ان کو تو سب سے زیادہ چڑھ ہے ہمارے تاش کھیلنے سے یہاں تک کہ گھر میں کبھی کوئی تاش کا پیکٹ رہنے ہی نہیں پاتا اور اگر کبھی ہم نے تاش کی ایک آدھ بازی برس چھ مہینے کے بعد کھیل لی تو اتنے ہی دنوں تک اس کی جواب دہی بھی کرنا پڑتی ہے اور اٹھتے بیٹھتے ہر وقت طعنے سنتے ہیں مگر جنت میں دیکھیں وہ کیونکر منع کرتی ہیں وہاں ہمارے اختیار میں ہو گا کہ جب چاہیں نظر بندی سے کام لے کر ان کی نظر باندھ دیں اور خود نہایت اطمینان سے تاش کھیلیں۔ ہم تاش کھیلیں گے۔ اور وہ دیکھیں گی کہ ہم کوئی نہایت اہم مسئلہ لے کر چند عالی دماغوں کے درمیان سلجھانے کو بیٹھے ہیں۔ اسی طرح

ہم شطرنج میں دن بھر مصروف رہیں گے۔ اور ان کی سمجھ میں یہی آئے گا کہ ہم کوئی ہنگامہ خیز کتاب لکھ رہے ہیں۔ مگر آپ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک قسم کی چوری ہوئی اور چوری کی ضرورت پیش آئی بیگم سے مرعوب ہونے کے بعد لہٰذا جانے دیجئے۔ اس نظر بندی اور سمجھ بندی کی ترکیبوں کو مگر آپ کے پاس اس کا کیا علاج ہے کہ ہماری حیثیت کی آپ بیوی میں بیگم کے دماغ کی اصلاح اس حد تک ہو جائے گی کہ وہی تاش جس کا نام سن کر وہ آگ بگولا ہو جاتی ہیں۔ جب ہم کھیلنا چاہیں گے تو بیگم نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ کہیں گی۔

"آپ نے تو تاش کھیلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں تو خود غور کر رہی تھی کہ آخر آپ کو تاش کی طرف کیونکر متوجہ کیا جائے۔

اور جب ہم تاش کھیل چکیں گے تو وہ پھر گلاب کی طرح شگفتہ ہو کر کہیں گی کہ "ایک بازی اور کھیل لیجئے میری خاطر سے ہی دیکھئے آپ کو میری ہی قسم ہے"۔ رہ گئی شطرنج یعنی وہ منحوس کھیل جس کو کھیلنے کے معنی بیگم کے نزدیک یہ ہیں کہ گھر سے برکت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے رحمت کے فرشتہ اس منحوس گھر کا راستہ بھول جائیں اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ گھر جس میں شطرنج کھیلی گئی ہو۔ اس طرح تباہ و برباد ہو جائے کہ بھارے کے زلزلہ کی تمام تباہیاں عبرت سے اس گھر کا منہ دیکھیں مگر اسی شطرنج کے لئے بیگم نہایت ہی اہتمام کریں گی۔ ہاتھی دانت کے مہرے بنوائیں گی۔ سنگ مرمر کی میز پر اس کی گنگا جمنی بساط ہو گی۔ اور

مہروں میں یہ خوبی ہوگی کہ ہر مہرہ اپنا نام خود سمجھے گا۔ اور زبان سے نام لیتے ہی اپنی چال چلا کرے گا۔ بیگم ہم سے شطرنج کھیلنے کے تقاضے کیا کریں گے اور ہم بیگم سے آنکھ بچا کر ان کو میکے بھیج کر یا چھپ چھپ کر دوستوں کے یہاں شطرنج نہ کھیلیں گے بلکہ بیگم کے زیر اہتمام خود ان ہی کے ساتھ دن رات شطرنج ہوا کرے گی۔

گھومنے کے سلسلہ میں حال یہ ہے کہ بیگم چاہتی ہیں کہ ہم دفتر جانے سے پہلے اور دفتر سے واپسی پر بس ان ہی کی خدمت میں حاضر رہا کریں۔ وہ ڈٹی کاٹتی جائیں اور اپنے پرائے آئے گئے محلہ پڑوس والوں کے واقعات اور حالات کے سلسلہ میں بیکار دماغ چاٹیں اور ہم اپنے دماغ کو اس طرح بے غذا ان کے سامنے رہنے دیں گویا دماغ کیا ہے "ماحضر" ہے اور یہ سمجھ کر چپ رہیں کہ ؎ روزی خود بخورد بر خوان تو"

مختصر یہ کہ نہ کہیں سیر کو جائیں نہ گھر کے باہر قدم نکالیں لیکن ہماری جنت میں ہم ہوں گے اور سیر سپاٹا جہاں چاہیں گے، جائیں گے۔ اور جب جی چاہے گا گھومیں گے بلکہ اگر خود ہم نہ جائیں گے تو بیگم ہم کو گھومنے کے لئے بھیجا کریں گی کہ "جائیے ذرا تفریح ہو جائے گی۔ تازہ دم ہوا جسم کو لگے گی دماغ تازہ ہو جائے گا۔ اگر آپ تھک گئے ہوں تو سواری منگا دوں اس پر چلے جائیے۔ مگر جائیے ضرور۔" گویا اب تو ہم باندھ کر رکھے جاتے ہیں۔ اور اپنی جنت میں گھیر گھیر کر گھومنے پھرنے بھیجے جائیں گے۔ ذرا ہماری جنت کا تصور تو کیجئے کہ کس قدر دلچسپ اور کیسی آزادی کی فضا میں

سے معمور جگہ ہوگی۔ یہاں تو یہ حال ہے۔ کہ اگر کسی دن کسی حادثہ یا سانحہ کے سلسلہ میں یا کسی عمدہ فلم یا کسی جلسہ کے چکر میں چراغ جلے کے بعد گھر آنا پڑا تو بس یہ سمجھ لیجئے کہ قیامت کا سامنا ہے پھر لاکھ لاکھ سمجھائیے خوشامد کیجئے منت سماجت سے کام لیجئے مگر یہ تو گویا طے ہی ہے کہ بدمعاشی کے خطاب سے نہیں بچ سکتے۔ اور محض یہ اتفاقی تاخیر ایسا سنگین جرم بنجاتی ہے جو قابل دست اندازی ہی نہیں بلکہ مچلکہ اور ضمانت سے بھی کچھ آگے ہی سمجھی جاتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کی تفریح جب تک ایک مستقل عذاب میں مبتلا نہیں کر لیتی۔ اس وقت تک گویا ہم کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا مگر ہماری جنت میں یہ نامعقول پابندیاں اپنے منحوس قدم بھی نہیں نہیں رکھ سکتیں وہاں تو اگر ہر روز عید ہوگی تو ہر شب کو شب برات بننے کا حق بھی حاصل ہوگا۔ راتوں کی جوان تاریکیوں میں ہم اپنے جنتی احباب کو ٹہلایا کریں گے۔ وقت کا دھڑکا ہمارے لطف کو کرکرا نہ کرے گا۔ بلکہ ہم آزاد ہوں گے کہ جب چاہیں گھر جائیں چھ بجے شام کے بجائے سات بج جاتا گیا یعنی ہم تو بارہ اور ایک بجے رات کو بھی اگر گھر آئیں گے تو بیگم کو اپنے استقبال کے لئے خوش آمدید لکھی ہوئی شالیمار پائیں گے اور وہ مسکرا مسکرا یہی کہیں گی کہ "خدا کا شکر ہے کہ آج میرے سرتاج کا اتنا وقت دلچسپیوں میں گذرا اللہ اس سے زیادہ آپ کو بے فکریاں اپنے خزانۂ غیب سے عطا کرے"، بیگم کے اس خلوص اور خیر مقدم سے ہمارا وہ تمام خون رگوں میں گردش کرجائے گا جو آجکل رات گئے آنے کے جرم میں ڈر کے مارے خشک ہو جاتا ہے پھر ہم

اپنی جنت میں اپنی گلاب سے زیادہ شگفتہ بیگم کو جو آجکل پھانسی کا حکم سنانے والے سیشن جج سے زیادہ خشک نظر آتی ہیں، اپنی دلچسپیوں کی تفصیل سنائیں گے۔ کہ یوں احباب میں لطف رہا۔ اور یوں ہا ہا ہو ہو میں وقت کٹا اور بیگم جو اس دنیا میں احباب کا نام سن کر مشین گن کی صورت میں مشتعل ہو جاتی ہیں اور جن کی بد دعاؤں سے ہمارے سیکڑوں دوست فائدہ اٹھا کر۔ ع

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

کا سلسلہ بنے ہوئے ہیں وہی بیگم ہمارے ایک ایک دوست کا نام لے لے کر اس کے اور اس کے بال بچوں کو دعائیں دیں گی کہ "یا اللہ اس شخص نے جیسا میرے شوہر کو آج خوش رکھا ہے تو بھی اس کو ایسا ہی خوش رکھنا اور اس کی اس نیکی کا بدلہ تو اس کے بال بچوں کو دینا!"

پھر ہم ان سے اپنی ان تمام دلچسپیوں کا ذکر کریں گے جن کو اس دنیا میں وہ غیر شریفانہ باتیں۔ شہدپن۔ آوارہ گردی وغیرہ کہا کرتی ہیں مگر ہماری جنت میں ان ہی تمام باتوں کو وہ ہماری شرافت۔ ہماری نیکی اور ہماری نیک چلنی کی علامتیں سمجھیں گی۔ خدا کی پناہ اگر آجکل ہم گھر جا کر یہ کہنے کے بجائے کہ "ہم وعظ سن رہے تھے"۔ کہیں یہ کہدیں کہ "آج سینما میں ایک مشہور گانے والی کا گانا سن کر آرہے ہیں" تو یقین جانئے کہ ایسی خبر لی جائے کہ پھر خود بھی سرگم الاپنا پڑے۔ مگر یہی بیگم جنت میں ایسی جنتی بن جائیں گی۔ کہ ہم خود ہی ان سے کہیں گے کہ "آج ایک حور نے

ایسا لاجواب گانا سنایا کہ واہ واہ سچ تو یہ ہے کہ جیسی وہ حسین تھی ویسی ہی حسین آواز بھی پائی ہے۔

بیگم مسکرا کر کہیں گی "اللہ اس حور کا بھلا کرے جو میرے شوہر کو اس قدر پسند آئی۔" کیوں صاحب ہم پوچھتے ہیں کہ ہم کو تو خیر چھوڑیئے ہمارے حال پر، مگر ہمارے علاوہ بھی ہے کوئی اپنی بیوی کا شوہر جو جو اس دنیا میں کسی حسین سے حسین عورت کو اپنی بدصورت سے بدصورت بیوی کے سامنے حسین کہکر بیوی کے قہر وغضب سے بچ جائے اور ہے کوئی ایسی بیوی اس دنیا کے پردہ پر کسی شوہر کی زوجیت میں جو اپنے شوہر کی پسندیدہ عورت کو اس طرح بیساختہ دعائیں دے مگر یہ صرف ہم ہوں گے اور جنت میں ہماری جنتی بیگم جن سے اسقدر خوشگوار تعلقات ہوں گے۔ وہ خوشگوار تعلقات جنکے بغیر یہ دنیا جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے ذرا غور تو کیجئے کہ جب ہم اپنی بیگم سے کہیں گے کہ "بیگم وہ حور ایسی تھی کہ تمہاری ایسی سیکڑوں بیویاں اس پر قربان کر دی جائیں"، تو بیگم بجائے جلنے کے نہایت اشتیاق کے ساتھ کہیں گی کہ "میرے سرتاج آپ کے انتخاب پر قربان ہو جانا میرا اور آپ کی سیکڑوں بیبیوں کا فرض ہے" بیگم کے الفاظ پر ہم جھوم جائیں گے اور آخر ان سے کہدینا پڑے گا کہ "اے وفا کی دیوی جنت کی تمام حوریں تجھ پر قربان"، بیگم کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو ہوں گے اور ہمارے دل میں بیگم کی دہشت نہیں بلکہ طوفانی محبت یہ ہوگی ہم سفر بیاہتو شوہر کی جنت۔

شوہر یا ایڈیٹر

ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ ہم ایک شوہر ہیں اور ہم اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ہم ایک ایڈیٹر ہیں مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کے نزدیک ہم صرف شوہر ہیں اور اخبار کے ڈائرکٹر صاحب مجکو محض ایڈیٹر سمجھتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ بیگم صاحبہ اور ڈائرکٹر صاحب دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایسے مستحکم دلائل رکھتے ہیں کہ اب میں خود اس فکر میں ہوں کہ در اصل میں ایڈیٹر ہوں یا شوہر اور اگر صرف ایڈیٹر ہوں تو شوہر کیسے ہو سکتا ہوں۔ اور شوہر ہوں تو ایڈیٹر کیونکر بنا ہوا ہوں۔ یعنی۔ ع۔

اگر نہیں ہوں تو کیوں اور ہوں تو کیا ہوں میں

بیگم صاحبہ کا دعویٰ یہ ہے کہ میں در اصل شوہر ہوں اور ایڈیٹری محض ایک معاشی ذریعہ ہے یعنی وہ یہ کہتی ہیں کہ اگر میں ایڈیٹر نہ ہوتا تو بھی شوہر ضرور ہوتا یعنی معاشی حیثیت سے تو یہ ممکن تھا کہ اگر میں ایڈیٹر نہ ہوتا تو فلم ایکٹر ہوتا فلم ایکٹر نہ ہوتا تو بڑھئی ہوتا بڑھئی نہ ہوتا تو زردوز ہوتا مختصر یہ کہ سب ہی کچھ ہو سکتا تھا مگر شوہر ہونا برحق تھا۔ اور بحیثیت ایک شوہر کے میرے لیے یہ ناممکن تھا کہ میں کچھ اور ہو سکتا یعنی کچھ ہوتا یا نہ ہوتا مگر شوہر

تو ہونا ہی پڑتا۔ لہذا ثابت یہ ہوا کہ شوہر ہونا اصل حقیقت ہے اور یہ ایڈیٹری محض ایک ضمنی حیثیت ہے۔ ان مستحکم دلائل کے جواب ڈاکٹر صاحب کے ...... دعوے کو ملاحظہ فرمائیے کہ وہ بھی اپنی جگہ پر ایک ناقابل انکار استحکام کا حامل ہے ان کا خیال یہ ہے کہ شوہر ہونا تو گویا ایک نجی اور گھریلو بات ہے مگر اس خاکسار کی عملی اور ذمہ دارانہ حیثیت یہ ہے کہ یہ خاک بسر ایڈیٹر ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میری شوہرانہ حیثیت میری ایڈیٹرانہ حیثیت کی منت پذیر ہے یعنی اگر میں ایڈیٹر نہ ہوتا تو جس آسانی کے ساتھ موجودہ اہل خانہ کا شوہر بن گیا ہوں نہ بن سکتا یہ تو ممکن تھا کہ میں ان بیوی کا نہ سہی کسی اور بیوی کا شوہر بن جاتا اور شوہر ہونے کے لیے کسی خاص کاوش کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ ع

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

گویا یہ تو ایک ایسی معاملت تھی جو بغیر ہاتھ پیر ہلائے بھی ممکن تھی مگر یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جو شخص ایڈیٹر ہونے والا ہوتا ہے وہ دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو یعنی جو دنیا میں کچھ نہیں کر سکتا وہ ایڈیٹری کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس بے روزگاری کے دور میں بے روزگاروں کی جس قدر سرپرستی صحافت نے کی ہے شاید ہی کسی اور شعبہ نے کی ہو مختصر یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک شوہرانہ حیثیت تو خیر واہیات ہے۔ البتہ ایڈیٹرانہ حیثیت ہی صرف میری واحد حیثیت ہے۔

ڈاکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ کے اس اختلاف خیال کے بعد خود تم

اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حیثیتیں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتی ہیں اور کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا مگر فرق یہ ہے کہ ایڈیٹر حیلہ روزی ہے اور بیوی بہانہ موت، اب یہ سمجھئے کہ اگر روزی اور موت دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش برحق ہیں تو ایڈیٹرانہ حیثیت اور شوہرانہ حیثیت کا اجتماع ضدین بھی انگیز کرنا ہی پڑے گا اور دونوں کی اہمیت کا ایک ہی سانس میں اعتراف کرتے ہی بن پڑے گا مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کو ایڈیٹرانہ اہمیت کیونکر سمجھائی جائے۔ خیر وہ تو عورت ذات ہیں ان کا کیا سوال جبکہ ڈائرکٹر صاحب کا ایسا جہاندیدہ مرد ہماری شوہرانہ حیثیت کو سمجھنے سے قاصر ہے اور ان دونوں کی ناسمجھی نے اس خاکسار من ابتدائے شوہر لغایۃ ایڈیٹر کو عجیب دو عملی میں مبتلا کر رکھا ہے اور روز بروز اب تو یہی خیال دماغ میں جڑ پکڑتا جاتا ہے کہ خدا جس کو ایڈیٹر بنانے والا ہو اس کو اپنی قدرت کاملہ کے صدقہ میں شوہر نہ بنائے اور اگر شوہر بنانا مشیت ایزدی ہی ہو تو اس شوہر کو خواہ کچھ بنائے ایڈیٹر نہ بنائے مگر ایک سوال یہ ہے کہ اگر یہ دعا مقبول بھی ہو گئی تو آئندہ نسلوں کے کام آئے گی۔ ہم آخر کیا کریں جو بیک وقت شوہر بھی ہیں اور ایڈیٹر بھی

اخبار کا دفتر ایڈیٹر بن کر بیٹھنے کی جگہ تو ضرور ہوتا ہے مگر ایڈیٹری کرنے کی جگہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وہاں تو صبح سے شام تک ایڈیٹر صاحب سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جو قدم بوسی۔ اذیت کوشی اور

دماغ نوشی کے لئے برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کوئی صاحب محض شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لئے چلے آئے کسی صاحب سے گھر میں لڑائی ہوئی تو غم غلط کرنے کے لئے ایڈیٹر صاحب پر نازل ہو گئے۔ کسی صاحب کو کسی لیڈر کی کوئی بات بری معلوم ہوئی تو ایڈیٹر سے باز پرس کرنے کے لئے آموجود ہوئے کوئی صاحب جنرل فرانکو سے ناراض ہیں کہ ایڈیٹر کو ڈانٹنے آرہے ہیں۔ تو کوئی کسی ملکی تحریک سے بدعقیدہ ہیں کہ ایڈیٹر کو چیلنج دینے کے لئے آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اخبار کا دفتر اور دفتر میں ایڈیٹر کا کمرہ تو گویا "در خانہ انوری" ہوتا ہے کہ ہر بلا جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اسی کا پتہ پوچھتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ ادارت کے تمام فرائض تو گھر کے کسی خاموش گوشہ میں بیٹھکر انجام دیئے جائیں اور دفتر میں محض ایڈیٹر بنکر بیٹھا جائے۔ ڈائرکٹر صاحب بھی یہی چاہتے ہیں اور خود ہمارا خیال بھی یہی ہے مگر گھر کا حال یہ ہے کہ دن بھر کے بعد جب ہم دفتر سے گھر پہنچتے ہیں تو بیگم صاحبہ ہمارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ سمجھتی ہیں۔ اور سیاسیات میں الجھے اور تھکے ہوئے دماغ کو گھریلو معاملات اور خاندانی مناقشات سے تازہ کرنا چاہتی ہیں چنانچہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم تو بیٹھے قلم دوات لے کر تحریک وحدت العرب پر ایک زبردست لیڈنگ آرٹیکل لکھنے اور انھوں نے بکمال محبت تشریف لاکر فرمایا۔

"کیا اسوقت بھی کچھ لکھنا ہے"

ہم نے ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر پائنیر کے صفحات میں منھ چھپا کر کہا "ہوں"

مگر چونکہ ان کو اس "ہوں" سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا زور دیتے ہوئے دریافت کیا "بھائی جان کو کوئی خط لکھیے گا تو میرا سلام بھی لکھ دیجیے گا اور سلمان کو بھی پوچھ دیجئے گا۔

ہم نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا "اچھا لکھ دیا جائے گا۔"

بیگم نے اس خیال سے کہ شاید ہم وحدت العرب بھائی جان کو خط لکھتے ہوئے سلمان کو پوچھنا نہ بھول جائیں۔ مزید تاکید کرتے ہوئے کہا "دیکھیے ان کا خط آئے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔ بیحد خفا ہوں گے اور خفگی کی بات بھی ہے اب ان کا آخر ہے کون جو کچھ بھی ہیں۔ آپ ہی ہیں اور آپ کا یہ حال ہے کہ یہ کمبخت دفتر سر اٹھانے کی مہلت نہیں دیتا ایسی بھی کیا نوکری کہ آدمی دنیا کے کام ہی کا نہ رہے بس اسی کا ہو کر رہ جائے۔

بیگم کے ان الفاظ کی آواز تو بیشک کانوں میں جا رہی تھی مگر معنی اور مفہوم سمجھنے کے لئے دماغ کا جو حصہ مخصوص ہے۔ اس میں ایران افغانستان ترکستان۔ عراق اور البانیہ وغیرہ بسے ہوئے تھے لہٰذا ہم نے یکایک چونک کر کہا "متحدہ محاذ کی ضرورت ہے۔"

بیگم نے حیرت سے کہا: "کس چیز کی ضرورت ہے؟

ہم نے اپنے ہوش میں آکر کہا: "ایں کیا کہا؟

بیگم نے ہنسکر کہا "اے واہ خود ہی کچھ کہا۔ اور خود ہی سوال کر رہے ہیں میں نے تو یہ کہا تھا کہ بھائی جان کو خط ضرور لکھ دیجئے گا اور انہیں یہ بھی لکھ دیجئے گا۔ کہ باجی نے جس فراک کی پیمائش دی تھی۔ وہ درزی نے

کھودی ہے۔ اب شہریار کی آپ پھر سے بھجوا دیں تو اچھا ہے اور یہاں یہ بھی لکھئے گا کہ قوام پہونچا یا نہیں ________ وہ خط کا مضمون بتاتی رہیں اور ہم پھر اخبار پڑھتے پڑھتے ان کی طرف سے غافل ہو کر طہران اور استنبول پہونچ گئے اللہ جانے انھوں نے کیا کیا کہا ہوگا کہ یکایک ان کے آخری الفاظ کہ "میل جول رکھنے سے میل جول رہتا ہے" دماغ میں اس طرح گونجے کہ ہم نے بھی الفاظ کی پوری قوت کے ساتھ کہا "بیشک اتاترک اور رضا شاہ کو اس وقت بیدار ہونا چاہئے"۔

بیگم منھ کھول کر رہ گئیں اور ہم نے ان کو دیکھکر اپنی اس گمشدگی اور ازخود رفتگی کا احساس کرتے ہوئے ہنسکر کہا "نہیں سمجھیں میرا مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت اخبار کا کام کر رہا ہوں۔ اور آپ ہیں کہ خدا جانے کیا ارشاد فرمائے جاتی ہیں"!

بیگم نے جل کر کہا "چولھے میں گیا اخبار۔ ہر وقت اخبار ہر وقت اخبار اخبار نہ ہوا جان کا عذاب ہو گیا اب آپ اخبار ہی اوڑھا اور اخبار ہی بچھایا کیجئے"۔

ہم نے گھر میں پھوٹ پڑتے ہوئے دیکھکر وحدت العرب کے مسئلہ کو تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر دیا اور بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا "سنئے تو سہی میرے خیال میں آپ نے آج تک یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میں ایڈیٹر ہوں اور ایک ایڈیٹر ہر وقت ایڈیٹر ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں تو وہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا جبکہ اس کے دماغ میں کوئی مقالۂ افتتاحیہ کروٹیں لے رہا ہو۔ چنانچہ اس وقت ایڈیٹوریل لکھنے والا ہوں۔ دماغ

میں دبی خیالات بھرے ہوئے ہیں اور آپ خدا جانے کیا فرما رہی ہیں۔ میں ذرا یہ مضمون لکھ لوں تو بسر و چشم تعمیل حکم کروں گا۔"

بیگم نے سمجھنے کی کوشش کرنے سے گویا صاف انکار کرتے ہوئے کہا: "میں یہ پوچھتی ہوں کہ جب گھر پر بھی آپ کو کام کرنا پڑتا ہے تو آخر دفتر کی حاضری کیوں ضروری ہے۔ اور اگر دفتر کی حاضری ضروری ہے تو گھر پر آخر آپ کیوں کام کرتے ہیں کیا آپ چوبیس گھنٹہ کے ملازم ہیں اور گھر والوں کا کوئی حق آپ پر نہیں ہے کہ دو گھڑی گھریلو معاملات پر بھی کوئی بات چیت ہو سکے۔"

ہم نے کہا: "بیگم یہ بات نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دفتر میں آنے جانے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ وہاں یکسوئی کے ساتھ کچھ لکھا نہیں جا سکتا لہٰذا وہاں تو صرف لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں اور معمولی معمولی کام انجام پاتے ہیں مگر ایڈیٹوریل نہایت اہم چیز ہوتا ہے اور اس کو لکھنے کے لئے پوری یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ اہم کام گھر کے لئے اٹھا لاتا ہوں غالباً اب آپ سمجھ گئی ہوں گی۔"

بیگم نے کہا: "سمجھ تو گئی مگر صحت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں آخر دماغ کو کسی وقت آرام کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

ہم نے کہا: "ضرورت تو ہے مگر اس وقت آپ لکھ لینے دیں اس کے بعد اس سلسلہ میں بھی یکسوئی کے ساتھ تبادلۂ خیال ہو جائے گا۔"

بیگم صاحبہ نے ہمارے رخ لکھنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اچھا آپ

لکھیے مگر روز روز کا یہ جھگڑا ٹھیک نہیں ہے"

بیگم صاحبہ تو خیر یہ کہکر چلی گئیں اور ہم نے موقع غنیمت جان کر جلدی جلدی لکھنا شروع کر دیا لیکن ابھی تمہیدی فقرے بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ بڑے صاحبزادے اپنا کوک کا موٹر لئے ہوئے تشریف لائے اور اس میں کوک بھر کر ہمارے کانوں کے پاس جو اس کو چھوڑا ہے تو معلوم یہ ہوا کہ حکومت ترکیہ کا کوئی ہوائی جہاز عین ہمارے کان کے اندر گر پڑا ہے۔ ہم یکایک چونک پڑے اور ہمارے اس چونکنے پر صاحبزادے کو ایسی تفریح ہوئی کہ وہ قہقہہ بلند کرتے ہوئے ہماری گود میں آگرے اور اس وقت ہماری سمجھ میں آیا کہ ہم دول اسلامیہ کے متحدہ محاذ پر نہیں بلکہ غریب خانہ میں ہیں۔ اور یہ جو کچھ واقعہ ہوا ہے وہ میدان جنگ میں نہیں بلکہ گھر ہی پر بندہ زادے کے ہاتھوں ہوا ہے لہذا اس کو ڈانٹ کر کہا "کیا کرتے ہو۔ یہ کیا شرارت ہے" صاحبزادے نے کہا "آپ سمجھے ہوں گے کہ ریل گاڑی کان میں گھس گئی۔

ہم نے بدستور غصہ میں کہا "بھاگ جاؤ یہاں سے بدمعاش ہم کام کر رہے ہیں"

صاحبزادے نے کہا "اچھا تو پیسہ دیجئے۔

ہم نے غصہ میں کہا "جاؤ یہاں سے نہیں تو کان لیتے ہیں ہم تمہارے پیسہ قوت کہیں کا"

صاحبزادے نے وحدت العرب کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے

مچل کر کہا "پیسہ دیجئے"۔ ایسے ضدی بچوں سے خدا بچائے اب بتائیے کہ اس وقت ہمارا کیا حال ہو گا۔ جی چاہتا تھا کہ ان صاحبزادے کو سر سے اونچا اٹھا کر دے ماریں یا خود اپنی بوٹیاں نوچیں۔ غصہ میں جلبلا کر ہم نے قلم تو رکھ دیا اور اٹھکر صاحبزادہ کا کان جو پکڑتے ہیں تو انھوں نے اپنے دہانہ کو پوری وسعت کے ساتھ کھول کر وہ فلک شگاف نعرۂ احتجاج بلند کیا ہے کہ مسئلہ وحدت العرب تو خیر دماغ سے نکل ہی گیا مگر بیگم صاحبہ کے خلاف جو محاذ اتفاقی طور پر تیار ہو گیا تھا۔ اس نے دماغ کو اور بھی پریشان کر دیا کہ اب اگر وہ آ گئیں تو کیا جواب دیں گے۔ چنانچہ جو خطرہ تھا وہ پورا ہوا یعنی صاحبزادے کی آواز سن کر وہ آموجود ہوئیں اور آتے ہی ہم سے پوچھا "یہ کیوں رو دیا"

ہم نے کہا: "اسی سے پوچھئے کہ اس کو کس نے رلایا ہے؟"

بیگم نے بغیر اس سے پوچھے ہوئے کہا: "اس سے کیا پوچھوں آخر آپ بتاتے کیوں نہیں؟"

ہم نے ایک اقراری مجرم کی طرح کہا: "اس نے خود ہی ضد کی اور خود ہی مچل گیا۔ اب جو میں نے پیار کرنے کے لئے اٹھایا تو لگا رونے"

صاحبزادے نے حلق پھاڑ کر کہا "پیار کب کیا۔ ہمارے کان پکڑ کر مروڑ دیئے۔"

بیگم نے ہماری صورت دیکھی تو ہم کو ہنسی آگئی۔ بیگم نے اس کو اعتراف جرم سمجھتے ہوئے کہا "کیا اچھے معلوم ہوتے ہیں آپ کہ بچوں سے لڑتے ہیں

اب آپ ہی اس کو منائیے۔

ہم نے اپنے ایڈیٹوریل کی طرف سے صبر کرتے ہوئے کہا "منا تو رہے ہیں یہ لکھنے بھی تو نہیں دیتا۔

بیگم نے کہا: "ہاں تو آخر کب تک لکھنے دے۔ دن بھر تو آپ کو دیکھتا نہیں ہے اور اس وقت بھی آپ آتے ہیں تو کونے میں منہ ڈالے ہوئے لکھ رہے ہیں آخر اس کا بھی تو کچھ حق ہے۔

ہم نے کہا "بہتر ہے اس حق کی جس طرح کہئیے ادائیگی کروں"۔

صاحبزادہ نے خود ہی کہا: "ہم کو گھمانے چلئیے گا۔ نہیں تو ہم سے دوستی نہیں ہو سکتی"۔

ہم نے ایڈیٹوریل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا "چلو بازار چلیں"۔

اب آپ ہی بتائیے کہ اس وقت تو ایڈیٹوریل یوں رہ گیا۔ اور بیوی بچوں کی نذر ہو گیا۔ دوسرے دن جو دفتر پہنچے تو حسب معمول ملنے والوں کا ہجوم پایا۔ اب جو ایڈیٹوریل کو مکمل کرنے کے لیے چپراسی سے کہا کہ کسی کو کمرے میں نہ آنے دو تو ڈائرکٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا آج گھر پر ایڈیٹوریل نہیں لکھا تھا"

ہم نے کہا: "کیا بتائیں صاحب خانگی جھگڑے اور بیوی بچوں کے قصے مہلت ہی نہیں دیتے"۔

ڈائرکٹر صاحب نے ان جھگڑوں کو معمولی سمجھتے ہوئے کہا: "آپ بھی

ان گھریلو باتوں کو اہمیت دیتے ہیں یہ سب قصے تو ہوا ہی کرتے ہیں۔"

ہم جلے ہوئے تو تھے ہی لہذا ان سے ترکی بہ ترکی کہا: "خدا کرے آپ کی شادی ہو اور ان جھگڑوں سے آپ کو پالا پڑے۔"

ڈائرکٹر صاحب نے کہا: "شادی کیا پھر سے ہو گی۔ شادی تو ہو چکی ہے اور بیوی بھی وطن میں ہے۔ مگر یہ جھگڑے وگڑے کچھ نہیں ہیں۔"

ہم نے کہا: "ہاں تو ملاح در جیبن کشتی در فرنگ جھگڑا کیا خاک ہو"

ڈائرکٹر صاحب نے کہا: "آپ بھی میری پیروی کریں۔ اور بال بچوں کو وطن پہونچا دیں نا۔"

اب بتائیے کہ اگر یہ مشورہ بیگم سن پائیں تو کیا ہماری ایڈیٹری اور یہ ملازمت رہ سکتی ہے وہ فاقہ کشی کر لیں گی مگر یہ نوکری نہ کرنے دیں گی۔ جس میں بیوی کو وطن میں رکھنے کے مشورے دیئے جاتے ہوں۔"

حادثات

۳۳ء ہمارے لئے مبارک و مسعود ثابت ہوا یا نامبارک و منحوس اس کا فیصلہ محض حادثات کی تفصیل سننے کے بعد آپ خود کر لیں گے۔

ہم خود اپنی زبان سے کیا کہیں۔ اس سال کے پہلے مہینہ کا پہلا ہی ہفتہ تھا کہ عزیز از جان ٹائیگر کو کھانسی شروع ہوئی اور اس کھانسی کی اطلاع ہم کو اس وقت ہوئی جب کہ مرض اپنے ابتدائی مدارج طے کر کے استحکام کی منزل تک پہونچ گیا تھا ہم ٹھہرے ملازمت پیشہ آدمی صبح اٹھ کر دفتر چلے جاتے تھے۔ اور شام کے قریب اس طرح تھکے ماندے گھر پہونچتے تھے کہ خود اپنا ہوش نہ ہوتا تھا۔ رہ گئیں بیگم انھوں نے ٹائیگر غریب کو ہمیشہ ایک کم حقیقت کتا سمجھا۔ اور اس کی محبت کی کبھی قدر نہ کی ان کے نزدیک ٹائیگر کی بیماری گویا کوئی بات ہی نہ تھی اندازہ لگا لیجیے ذکر کرتیں آخر ایک روز ہم نے خود ٹائیگر کو مضمحل دیکھ کر بیگم سے پوچھا "یہ ٹائیگر آج کچھ پژمردہ سا نظر آرہا ہے۔ آخر کیا بات ہے۔

بیگم نے ناک بھوں چڑھا کر کہا بد کھانسی ہو گئی ہے کمبخت کو۔

ہم نے محسوس کیا کہ گویا کسی نے کلیجہ پر گھونسہ مارا اور تڑپ کر پوچھا

کب سے کھانسی ہے اس کو"۔

بیگم نے لاپرواہی سے کہا: "اب مجھے دن تو یاد نہیں ہے ہاں کوئی سات آٹھ روز سے کھانسی ہو گئی ہے"۔

ہم نے کہا: "اور نہ کوئی دوا نہ کوئی پرہیز"۔

بیگم نے تنفر سے کہا: "یہ چونچلے آپ ہی کو آتے ہیں۔"

ہم نے واقعی متفکر ہو کر کہا: "یہ مرے گا یا جیئے گا"؟

بیگم نے جل کر کہا: "مرے ہوا یا جیئے میں کیا جانوں"؟

ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ رفیقہ حیات کی اس سرد مہری نے ہمارا دل توڑ دیا خدا جانے ٹائیگر نے جب یہ الفاظ سنے ہوں گے۔ تو اس غریب کے احساس کو کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی بہر حال ہم نے ٹائیگر کو چمکار کر بلایا اور اس کا طبی معائنہ جس حد تک خود کر سکتے تھے کیا وہ یقیناً کمزور ہو گیا تھا اور اس کے تنفس میں ایک خاص قسم کی تشویش انگیز کیفیت پیدا ہو گئی تھی پھیپھڑوں کی آواز بھی صاف نہ تھی۔ اور دل کی حرکت بھی کبھی اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ گویا سول سروس کپ کی ریس ہے اور کبھی اس قدر سست کہ گویا ع

ایک کچھوے کے آگئی جی میں سمجھیے سیر و گشت خشکی میں ہے

بہر حال ٹائیگر کی یہ حالت دیکھ کر ہم کو سخت تشویش پیدا ہو گئی اور رات جوں توں گزار کر صبح ہی ہم اس کو لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے اور ان کو مریض کا تمام حال سنا کر خوب اچھی طرح معائنہ کرایا۔ اس کے بعد ان کے مجوزہ نسخہ کو نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کرانے لگے۔ انتہائی

پرہیز بھی ہوتا رہا۔ اور تیمارداری میں بھی کوئی کسر ہم نے اٹھا نہ رکھی۔ یہاں تک کہ دو ایک روز کی رخصت بھی ہم کو لینا پڑی مگر غریب ٹائیگر کا وقت آچکا تھا لہذا ع۔ الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔

اور آخر کار ہمارے ٹائیگر نے ہم کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ ٹائیگر آنجہانی بظاہر ایک کتا تھا مگر اس کا شجرہ ہمارے پاس محفوظ ہے جو اصحاب کہف کے کتے سے تو خیر نہیں ملتا تھا مگر وہ ایک نجیب الطرفین گرے ہاؤنڈ ضرور تھا اور ہم سے جو خاص محبت اس کو تھی اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس وقت بھی اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم رہی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے کھڑا ہوا اپنی دم کی جنبشوں اور اپنی کمر کی لطیف لچک کے ساتھ زبان نکالے ہوئے ہانپ ہانپ کر اعلان خلوص کر رہا ہے۔ اب اس کی گردن کا پٹا اس کی زنجیر اور اس کے کھانے کے برتن دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے گھر بغیر اس کے ویران نظر آتا ہے کان اس کی آواز کے لئے ترس کر رہ گئے ہیں وہی آواز جس سے پہلے تمام گھر گونجا کرتا تھا۔

ٹائیگر کا داغ اٹھائے ہوئے ابھی مشکل سے ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ خدا جانے کون ظالم ہماری بائیسکل غائب کر لے گیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ گویا ہمارے پیروں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ آہ کیا زمانہ تھا وہ بھی ہم اپنی گمشدہ

بائیسکل پر ادھر سے اُدھر فراٹے بھرتے ہوئے نظر آتے تھے مگر اب ہم ہیں اور بائیسکل کی تلاش میں پاپیادہ کوچہ نوردیاں۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک چکے ہیں۔ اور تھکنے کی بات بھی ہے کہ بائیسکل کو پیدل ڈھونڈھا جائے ہم تو خیر اس کے ملنے کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں مگر خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے پولیس کے اس سائیکل اسٹاف کو جو برابر ہم کو بھی تلقین صبر کر رہا ہے کہ بائیسکل ضرور مل جائے گی۔ البتہ یہ طے نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں ملے گی یا اس کے بعد۔ بہرصورت ایک موہوم سی امید ہے جو زندگی کا سہارا بنی ہوئی ہے ورنہ یقین جانئے کہ جب بائیسکل پر سوار ہو کر لوگ ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں تو ہم کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ خدا جانے اب ہماری بائیسکل کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کو ہماری اس بیقراری کی خبر بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال ہماری دعا تو یہ ہے وہ جہاں بھی ہو خوش ہو اور خدا اس کو تمام آفات ارضی وسماوی اور تمام امراض ٹیوب وٹائر سے محفوظ رکھے دراصل اس کی گمشدگی کے سلسلہ میں غلطی ہماری ہی تھی کہ ہم نے اس کی کبھی قدر نہ کی اور ہمیشہ بغیر قفل کے نہایت ناقدری کے ساتھ چھوڑ دیا کرتے تھے چنانچہ کسی قدردان نے اس کو دیکھ لیا اور اپنی عزت و آبرو کو خطرہ میں ڈال کر اس کو لے اڑا ظاہر ہے کہ وہ ہم سے زیادہ مستحق تھا ورنہ بائیسکل کے لئے اپنے کو قابل دست اندازی پولیس ثابت نہ کرتا مگر سچ کہا ہے کسی نے کہ انسان کچھ کھو کر پاتا ہے چنانچہ اب رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ ایک مرتبہ ہماری گمگشتہ بائیسکل مل جاتی۔ اور ہم قفل ڈالنے کے تمام ارمان جی بھر کر

پورے کر لیتے مگر آہ اب وہ کہاں کاش ہماری بائیسکل کے کان ہوتے وہ سن سکتی اور ہم نہایت درد بھری آواز کے ساتھ اپنا فسانۂ فراق ان کو سناتے کہ ؎

تمہارے جانے سے کیا ہم پہ بیکلی نہ ہوئی ۔۔۔ گئی ہو جب سے یہاں صبح و شام بھی نہ ہوئی
نتیجہ دیکھ لو کوچہ نوردیوں کا ذرا ۔۔۔ وہ درد پیر میں اٹھا کہ پھر کمی نہ ہوئی
عجیب دردِ محبت ہے جو ہے ٹانگوں میں ۔۔۔ اذیت ایسی ہوئی ہے کہ جو کبھی نہ ہوئی
تمہارے ہجر میں پیدل جو اب گزرتی ہے ۔۔۔ ہماری موت ہوئی یعنی زندگی نہ ہوئی
یہ ڈر ہے ہو کے رہیگا اب ہم پہ جرمانہ ۔۔۔ کہ وقت پر کبھی دفتر کی حاضری نہ ہوئی
عدم کی راہ بھی پیدل تو ہم سے ہو گی طے ۔۔۔ دگرنہ زیست کہ کیا تھا ہوئی ہوئی نہ ہوئی

بائیسکلوں کے اس اغوا کے سلسلہ میں اگر لکھنؤ کی پولیس لاہور کی پولیس کی تقلید کرتی تو شاید آج ہم کو یہ دکھڑا نہ رونا پڑتا اور ہمارے پیروں پر یہ بیوگی کا عالم طاری نہ ہوتا۔ لاہور کی پولیس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں اس نے کوئی بغیر قفل کی بائیسکل رکھی ہوئی دیکھی فوراً اس میں پنکچر کر دیتی ہے۔ پنکچر سے مختلف فائدے ہیں۔ اول تو یہ لاپروائی کی ایک سزا ہے اور غیرت داروں کے لئے نہایت کافی انتباہ دوسرے بائیسکل چوروں کی ہمت بھی ذرا مشکل سے ہو سکتی ہے کہ وہ پنکچر شدہ بائیسکل کو گھسیٹ کر لے جائیں۔ بائیسکل پر بیٹھکر بھاگ جانا دوسری بات ہے مگر بائیسکل کو اپنے اوپر سوار کر کے بھاگنا ذرا مشکل کام ہے۔ مختصر یہ کہ ہم کو لاہور پولیس کا یہ طریقہ اس قدر پسند آیا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ

مستقل طور پر بغرض رفاہ عام پبلک جگہوں میں پنکچر کرتے پھرا کریں تاکہ ماجور بھی ہوں اور مثاب بھی۔

ٹائیگر اور بائیسکل کے بعد داد دیجیے ہماری سخت جانی کو کہ ہم ایک تیسرا داغ بھی اس ایک دل پر کھائے ہوئے زندہ بیٹھے ہیں اور خدا جانے ابھی اور کیا کیا صدمے ہماری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ ٹائیگر کی موت اور بائیسکل کے اغوا نے دل و دماغ کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے۔ کہ اگر ہم غم غلط کرنے کی کوشش نہ کریں تو خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لہذا دل بہلانے اور ہر وقت کی غم آگینی کو دور کرنے کے لئے شامت اعمال ایک مشاعرہ منعقد کر بیٹھے مشاعرہ آپ کی دعا سے بے حد کامیاب ہوا۔ مگر مشاعرہ کے اختتام پر معلوم ہوا کہ غزل خواہ کسی کی مقبول ہوئی ہو۔ مگر جوتہ ہمارا مقبول ہوا تھا یعنی اس کا کہیں پتہ نہ تھا ہر طرف پہلے تو اس کو ڈھونڈھا۔ اور آخر کار جوتہ سے ہاتھ دھو کر بیٹھ رہے ــــ معلوم نہیں کہ جوتہ کی رعایت سے ہاتھ دھونا زیادہ صحیح ہے یا پیر دھونا بہرحال اس مسئلہ پر کوئی اہل زبان روشنی ڈالے گا ہم تو صرف اہل پاپوش ہیں ــــــــ بہرحال اپنے جوتہ کو حاصل مشاعرہ سمجھنے کے بعد ہم صبر کر کے بیٹھ تو رہے مگر آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ جوتوں اور مشاعروں کا مسئلہ روز بروز اہمیت حاصل کرتا جاتا ہے۔ اور ضرورت اس کی ہے کہ مفکرین وقت اس طرف اپنی توجہ مبذول کریں کہ مشاعروں کی وجہ سے جوتے یا جوتوں کی وجہ سے

مشاعرے کیونکر چھوڑے جا سکتے ہیں۔ حال
یہ ہے کہ مشاعروں میں شعراء اور سامعین کے علاوہ ایک خاص جماعت
اپنے بوسیدہ جوتے بغرض تبادلہ پہنکر تشریف لاتی ہے۔ اس جماعت
کے افراد اپنے بوسیدہ جوتے چھوڑ جاتے ہیں اور جس کسی کا نیا جوتہ پیر
میں ٹھیک آجائے پہنتے ہیں۔ اور سر بہ پیر رکھ کر بھاگتے ہیں۔ بشرکائے
مشاعرہ تو شعر سن سن کر جھومنے اور داد دینے میں مصروف رہتے ہیں
اور وہاں بے خبری کے عالم میں یہ معاصرانہ تبادلہ تکمیل کو پہونچ جاتا
ہے۔ چنانچہ ہمارے جوتہ کی گمشدگی کا افسانہ یہ ہے کہ وہ غریبانہ
قسم کا جوتا نہیں ہے بلکہ وہ جوتہ جو ڈنر کے لباس کے ساتھ پہنا جائے
اس کو ہم نے لب فرش چھوڑ دیا اور خود انتظامات میں مصروف رہے
یہاں تک کہ جب آدھی رات کو مشاعرہ ختم ہوا اور ہم کو جوتے کی
ضرورت پیش آئی تو معلوم ہوا کہ وہ موجود نہیں ہے۔ چپکے چپکے ہر
ایک کے پیر پر نظر ڈالی اور آخر مایوس ہو کر ایک ایک کا منہ دیکھنے
لگے مگر نہ کسی کے پیروں میں جوتے کا پتہ چلا۔ اور نہ کسی کے چہرے پر
جوتے کے آثار نظر آئے۔ لہٰذا ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

جب سب لوگ جا چکے تو ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ایک گملہ کے پیچھے
کوئی نہایت خوفناک قسم کا جانور دانت نکالے ہوئے بیٹھا ہے
ہم نے دوڑ کر بندوق اٹھالی۔ تاکہ اس جانور کے مہلک حملہ سے
اپنے کو محفوظ رکھ سکیں مگر قریب جا کر جو دیکھا تو دراصل ایک جوتا

تھا۔ جو ہمارے جوتے کے نعم البدل کے طور پر ہم کو ملا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کو جوتا کہنا یا جوتا سمجھنا ہی ایک قسم کی زیادتی ہے ورنہ وہ تو جوتے سے زیادہ طاعون زدہ چوہا مگر مچھ کا بچہ۔ ہاتھی کا نوزائیدہ لخت جگر یا پھولا ہوا مینڈک معلوم ہوتا تھا۔ گھسی ہوئی ایڑی کے بعد پھیلا ہوا پنجہ اور بگڑی ہوئی نوک کے ساتھ ہی آگے کے ٹانکے اس خوش سلیقگی سے کھلے ہوئے تھے کہ گویا گینڈے کو بے ساختہ ہنسی آگئی ہے اور ٹوٹی ہوئی ڈوریوں سے جیبھ اس طرح نکلی ہوئی تھی کہ گویا گرمی کی شدت سے کوئی کتا زبان نکالے ہوئے ہانپ رہا ہے یا گیدڑ منہ چڑھا رہا ہے یا کسی بھوکی بلی کے منہ سے کسی نے چوہا چھین لیا ہے۔ ہم نے الٹ پلٹ کر اس جوتے کو پہلے تو بغور دیکھا اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر اس کو بجنسہ عجائب خانہ میں صرف یہ لکھ کر رکھوا دیا جائے کہ "یہ ایک جوتا ہے" تو دیکھنے والے اس کو حیرت سے دیکھیں گے۔ اور تعجب سے کہیں گے کہ اگلے زمانے میں بھی لوگ کیسے جوتے پہنا کرتے تھے۔ بہرحال ہم نے اس جوتے کو نہایت احتیاط کے ساتھ پھکوا دیا تاکہ اس کی وجہ سے ہمارے گھر میں کوئی وبائی مرض پیدا نہ ہو جائے اور میونسپلٹی والے اس جوتے کو دیکھ کر ہمارا چالان نہ کر دیں۔ خیر ہمارا جوتا تو گیا مگر سوال یہ ہے کہ آخر مشاعروں کو جوتا چوروں سے کیونکر محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ حاضرین مشاعرہ کا محض شرکت مشاعرہ کے لئے برہنہ پا ہو جانا ممکن ہے اور

مشاعروں میں فرشی نشست بھی ناگزیر ہے اس لئے کہ کرسیوں پر تو مشاعرہ مشاعرہ نہیں بلکہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا اجلاس نظر آتا ہے لہذا ضرورت اس کی ہے کہ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر کوئی ایسا حل دریافت کیا جائے جو مشاعروں اور جوتوں کی اہمیت کو مساوی حیثیت سے ملحوظ رکھے۔ مال عرب پیش عرب والا طریقہ بھی اچھا تھا۔ بشرطیکہ لوگ برہنہ پائی کے مقابلہ میں پاپوش بدست ہونا پسند کر لیتے مگر اس کو عام طور پر اپنی توہین سمجھا جاتا ہے کہ اپنے جوتوں کی حفاظت کی جائے ایک صورت یہ ہے کہ لوگ مشاعروں میں ایسے جوتے پہن کر آیا کریں جو وہ نوکروں کو دینے والے ہوں یا جن کو اس لئے اٹھار کھا ہو کہ برسات میں پہنیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جوتے کوئی نہ چرائے گا اور اگر ایسے جوتوں کو بھی کوئی لے گیا تو اس چوری کا صدمہ نہ ہوگا۔ مگر مشاعروں میں بن ٹھن کر شرکت کرنے والے اس کو بھی گوارا نہ کریں گے۔ کہ ان کے پیروں پر پائے طاؤس کا شبہہ ہو آخر کار گھوم پھر کر اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ لب فرش جوتے اتارنے کی رسم ہی اڑادی جائے اور لوگ اپنے جوتے پہن کر بیٹھا کریں۔ تاکہ اگر چور چرائے تو جوتے کو اس کے مالک کے ساتھ چرائے ورنہ حسرت سے اچھے سے اچھا جوتا پیر میں بندھا ہوا دور سے دیکھے۔ اور دیکھ دیکھ کر رہ جائے جوتے پہن کر فرش پر محفل میں بیٹھنا بدتمیزی تو ضرور ہے مگر اس بدتمیزی سے نجات مل جاتی ہے جو جوتا کھونے کے بعد ایک خفت کی صورت میں جوتا کھونے والے پر اس طرح

طاری ہوتی ہے کہ گویا آپ نے جوتا کھویا نہیں بلکہ کسی کا جوتا چرایا ہے۔

ان تینوں حادثات کی تفصیل آپ سن چکے اب آپ ہی بتائیے کہ جس شخص کا کوئی سال اس قسم کے پیہم حادثات سے شروع ہوا ہو اس کا حال سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

بابو

بابو ہندوستان کی اس مخلوق کو کہتے ہیں۔ جو دفاتر میں فائلوں کی چہار دیواری کے درمیان ناک کی پھننگی پر عینک لگائے ہوئے کاغذ سیاہ کرتی ہوئی نظر آئے۔ اور اس کے متعلق دیکھنے والے کو نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ ہو سکے۔ کہ سائنس داں نے اپنے کمال سے ٹائپ کی طرح خط شکستہ لکھنے کی یہ انسانی صورت والی مشین ایجاد کی ہے جو پان بھی کھاتی ہے اور عینک بھی لگاتی ہے۔ کبھی کبھی بات بھی کرتی ہے اور اکثر گھورتی بھی ہے اور واقعی اگر بابو کی زندگی کا جائزہ لیجئے اور اس کے پروگرام پر غور کیجئے تو آپ کو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ انسان تو خیر برائے نام ہوتا ہے ورنہ زیادہ تر اس کے مشاغل مشین سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ روزانہ مقررہ وقت پر دفتر آنا۔ دفتر آکر ایک ہی قسم کے کام کو روزانہ انجام دینا مقررہ وقت پر دفتر سے جانا اور ایک مقررہ نظام کے ماتحت گھریلو زندگی بسر کرنا عام انسانوں کی طرح بابو کی زندگی میں مختلف قسم کے مدوجزر بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی دنیا کے صرف دو کرّے ہوتے ہیں۔ گھر اور دفتر۔ دفتر

اور گھر اور یہ دونوں کرۂ ایک دوسرے کے لازم و ملزوم بھی بن کر رہ جاتے ہیں یعنی بابو کا گھر دفتر کے سہارے قائم رہتا ہے اور دفتر گھر کی وجہ سے ہوتا ہے اگر بابو کو گھر کی فکر نہ ہو تو دفتر کی ہرگز پرواہ نہ کرے اور اگر دفتر نہ ہو تو گھر کا خدا ہی حافظ ہے۔ مگر باوجود اس ربط کے بابو کی گھریلو اور دفتری زندگی میں ایک مستقل تضاد ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر زیادہ گہرائیوں میں جائیے تو اس تضاد میں بھی آپ کو یکسانیت کی جھلک نظر آئے گی بلکہ اگر بابو سے پوچھیے تو شاید وہ گھبرا کر گھر کو دفتر یا دفتر کو گھر کہہ جائے اس لیے کہ اس بیچارے کی زندگی بحصۂ مساوی جن دو حصوں میں تقسیم ہوئی ہے ان میں سے ایک کو وہ گھر کہتا ہے اور ایک کو دفتر اور ان دونوں جگہوں کی علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں اس پر کچھ اس طرح ہوتی ہیں کہ اس کو جلدی میں گھر اور دفتر میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ غور کرنے کے بعد وہ بتا سکتا ہے کہ دفتر اور گھر دونوں میں گھر کون سا ہے اور دفتر کون سا۔

بابو نے اسی غلط بحث سے بچنے کے لئے دفتر اور گھر میں چند موٹی موٹی پہچانیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لی ہیں تاکہ گھر اور دفتر میں آسانی کے ساتھ امتیاز ہو سکے مثلاً گھر پر بیوائن ہوتی ہیں اور دفتر میں صاحب گھر پر بچے ہوتے ہیں اور دفتر میں اس کے دوسرے ہمعصر بابو کے گھر پر کہار ہوتا ہے اور دفتر میں چپراسی گھر پر کھانے کو ملتا ہے اور دفتر میں کھایا پیا ایک کیا جاتا ہے گھر پر لیٹا جاتا ہے اور دفتر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ گھر پر نون تیل لکڑی

کی فکر ہوتی ہے اور دفتر میں کیش بک - اکاؤنٹ بک اور لیجر کی فکر. گھر پر
دھوتی باندھی جاتی ہے اور دفتر میں دھوتی کے اوپر ایک شرعی پاجامہ یا
پتلون گھر پر حقہ یا ناریل پیا جاتا ہے اور دفتر میں آنکھ بچا کر بیڑی گھر پر
بچے پریشان کرتے ہیں اور دفتر میں اہل معاملہ اور اہل غرض حضرات
گھر پر بیوی کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے اور دفتر میں بڑے بابو یا چھوٹے
صاحب کی۔ ان چند موٹی موٹی پہچانوں میں سے ایک بابو نہایت آسانی
کے ساتھ بتا سکتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے گھر پر یا دفتر میں. دفتر میں
یا گھر پر ---- بابوؤں کی سیکڑوں قسمیں ہوتی ہیں اور بھانت بھانت
کے بابو اس ملک میں پائے جاتے ہیں مگر ان سب کی زندگی کم وبیش
ملتی جلتی ہوتی ہے اور ان سب کے حالات تقریباً یکساں ہوتے ہیں
خواہ وہ ڈاک بابو ہوں یا تار بابو. ٹکٹ بابو ہوں یا کسی اور قسم کے
بابو مگر ان سب کے حالات زندگی صرف یہ ہوتے ہیں کہ دفتر میں
کثرت کار اور گھر پر کثرت اولاد دفتر میں ترقی کی فکر اور گھر پر بیوائن
کے تقاضے سے لڑکی کی شادی کا غم. دفتر میں بڑے بابو کا اندیشہ اور
گھر پر رام چرن کی مہتاری کا خطرہ. دفتر میں اہل معاملہ کے سامنے شیر
اور بڑے بابو کے سامنے بھیگی بلی اور گھر پر بچوں کے باپ اور بچوں
کی ماں کے صاجزادے. گھر پر مہاجن سے قرض لینے کی فکر اور دفتر میں
بلیت
پہلی تاریخ کے لیے دن گننا مختصر یہ کہ ایک بابو کی تمام سیاست تمام کا
اور تمام اہلیت کا دائرہ محدود ہے. گھر اور دفتر کے درمیان اسکے

علاوہ خواہ دنیا میں کچھ ہو اس کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کی بلا سے اسپین کی حکومت تبدیل ہو جائے اس کو تو بڑے صاحب کی تبدیلی کی خبر بھی بالکل عین وقت پر ہوتی ہے۔ ہر ہٹلر کے ارادے کیا ہیں۔ اس پر وہ غور کرے جس کو بڑے بابو کے ارادوں کو سمجھنے سے فرصت ہو۔ جدید دستور کے تشلیب دفراز اس کے نزدیک مہمل ہوتے ہیں اس لئے کہ دفتر میں جو جدید انتظام ہوتا ہے اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جشن تاجپوشی میں اس کے نزدیک سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ دفتر میں ایک دن کی چھٹی تھی۔ اور اسی دن کے لئے جنس خرید کر لانا پڑی اور تمام دن غلّہ کی منڈی میں ترازو اور بانٹ سے واسطہ پڑا۔ ہندوستان کے سیاسی جمود کا جو کچھ بھی نتیجہ ہو۔ بہرحال وہ تو یہ جانتا ہے کہ اس کے دفتر پر جمود کی کیفیت نہ کبھی طاری تھی نہ آئندہ اس قسم کی کوئی امید ہے جمعیتہ اقوام کا چونکہ اس کے دفتر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اس سے دلچسپی لینا ہی نہیں چاہتا۔ ہندوستان کی قومی زبان اردو ہے یا ہندی اس کے لئے دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ اس کو تو گھر میں ہندوستانی بولنا ہے اور دفتر میں انگریزی لکھنا۔ فقیرابی کی سرگرمیوں پر وہ اس لئے غور نہیں کرتا کہ جہاں تک اس کا خیال ہے۔ فقیرابی کا کوئی اثر اس کے دفتری معاملات پر نہیں پڑ سکتا۔ مختصر یہ کہ وہ دنیا کے تمام معاملات کو اپنی ناک کی پھننگی پر رکھی ہوئی عینک سے اگر دیکھتا بھی ہے تو اپنے سے غیر متعلق سمجھکر نہایت مہمل سمجھتا ہے ورنہ عام طور پر وہ اپنے فائلوں ہی کو

مستقل طور پر بغرض رفاہ عام بائیسکلوں میں پنکچر کرتے پھرا کریں تاکہ ماجو بھی ہوں اور ثواب بھی۔

ٹائیگر اور بائیسکل کے بعد داد دیجئے ہماری سخت جانی کو کہ ہم ایک تیسرا داغ بھی اس ایک دل پر کھائے ہوئے زندہ بیٹھے ہیں اور خدا جانے ابھی اور کیا کیا صدمے ہماری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ ٹائیگر کی موت اور بائیسکل کے اغوا نے دل و دماغ کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے۔ کہ اگر ہم غم غلط کرنے کی کی کوشش نہ کریں تو خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لہذا دل بہلانے اور ہر وقت کی غم آگینی کو دور کرنے کے لئے شامت اعمال ایک مشاعرہ منعقد کر بیٹھے مشاعرہ آپ کی دعا سے بے حد کامیاب ہوا۔ مگر مشاعرہ کے اختتام پر معلوم ہوا کہ غزل خواہ کسی کی مقبول ہوئی ہو۔ مگر جوتہ ہمارا مقبول ہوا تھا یعنی اس کا کہیں پتہ نہ تھا ہر طرف پہلے تو اس کو ڈھونڈھا۔ اور آخر کار جوتہ سے ہاتھ دھو کر بیٹھ رہے۔ معلوم نہیں کہ جوتہ کی رعایت سے ہاتھ دھونا زیادہ صحیح ہے یا پیر دھونا بہرحال اس مسئلہ پر کوئی اہل زبان روشنی ڈالے گا ہم تو صرف اہل پاپوش ہیں ——— بہرحال اپنے جوتہ کو حاصل مشاعرہ سمجھنے کے بعد ہم صبر کر کے بیٹھ تو رہے مگر آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ جوتوں اور مشاعروں کا مسئلہ روز بروز اہمیت حاصل کرتا جاتا ہے۔ اور ضرورت اس کی ہے کہ مفکرین وقت اس طرف اپنی توجہ مبذول کریں کہ مشاعروں کی وجہ سے جوتے یا جوتوں کی وجہ سے

کان دھلوانے کے بعد ہوا لگنے کے لئے دوا لینا بھی ضروری ہے ورنہ وہ
برا مان جائیں گی کہ میرے کلیجہ کی دھڑکن کا کوئی خیال ہی نہیں ہے
مختصر یہ کہ اسپتال سے دوا دوں کے خزانہ سے مالامال لڑکی کو لادے
اور لڑکے کی انگلی پکڑے ہوئے جس وقت بابو صاحب گھر پہونچیں گے
اس وقت دفتر جانے میں مشکل سے چند ہی منٹ باقی ہوں گے جلدی جلدی
الٹے سیدھے دس پانچ لقمے مار کر فوراً دفتر کے کپڑے پہنیں گے
ایک آدھ کش حقہ کا لیں گے اور بستہ سنبھال کر چھتری بغل میں دبائے
اس طرح دفتر کی طرف بھاگیں گے کہ گویا کوئی لاٹھی لئے ہوئے پیچھے
آرہا ہے یہاں تک کہ راستہ کی تمام چہل پہل ان کے لئے قابل
توجہ نہ ہوگی اگر کسی نے سلام کیا تو بغیر دیکھے ہوئے جواب دیدیا اور
اگر کسی نے آواز دی تو بہرے بن کر قدم اور تیز کر دیئے اب اگر کوئی
ان حضرت سے پوچھے کہ راستہ میں کیا ہو رہا تھا تو آپ اس طرح کورے
نکلیں گے کہ گویا اس راستے سے گذرے ہی نہیں ہیں۔

دفتر میں بابو جی کی شان البتہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کام کی کثرت
ہر چند آپ کو پن چکی کی طرح مصروف کار رکھتی ہے تاہم اگر کوئی اہل معاملہ
آگیا تو آپ اپنے کو اس کے نزدیک لاٹ صاحب سے کم ثابت
نہیں کرتے خصوصاً جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس شخص کے کاغذات
میرے ہی پاس ہیں اور میں ان کو نہایت آسانی کے ساتھ گڑھے
میں ڈال سکتا ہوں یا اگر چاہوں تو اسی وقت نکال کر برسوں کا

کام منٹوں میں کر سکتا ہوں رشوت لینے کا خیال نہ سہی بلا وجہ پریشان کرنا بھی نہیں چاہتے اگر اہل معاملہ کا کام نکل جائے تو ان کا کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اہمیت جتانا بھی ضروری ہے اور چونکہ اہمیت اسی طرح جتائی جا سکتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات کو نہایت مہتم بالشان بنا کر پیش کیا جائے لہٰذا سامنے رکھے ہوئے کاغذ کو بھی عنقا ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً اہل معاملہ نے نہایت خوشامد کے ساتھ کہا۔

"بابو جی آپ چاہیں تو چٹکی بجاتے میرا کاغذ نکلوا سکتے ہیں"

بابو جی پہلے تو اپنے کام میں مصروف رہیں گے اور کوئی جواب ہی نہ دیں گے اس کے بعد جب وہ پھر کہے گا:- "بابو جی" تو آپ صرف کاغذ پر نظر جمائے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر کہیں گے "ہاں ہاں۔ کہہ تو دیا کہ بڑے جھگڑے میں پڑا ہوا ہے وہ کاغذ"

اہل معاملہ پھر کھسیس نکال کر کہے گا۔ بابو جی بڑا نقصان ہو جائیگا آپ ذرا مہربانی کر دیں تو کام نکل جائے"

بابو جی چشم غلط انداز سے اس کو دیکھتے ہوئے کہیں گے "تم دیکھ رہے ہو کہ میں خالی تو بیٹھا ہوا ہوں نہیں کہ بس تمہارا کاغذ ڈھونڈھنے لگوں جب فرصت ہوگی اس وقت پرانے فائل نکال کر تلاش کر دوں گا"

اہل معاملہ خوشامدانہ کہے گا "یہ تو ٹھیک ہے۔ بابو جی مگر بڑی

مہربانی ہوگی۔ میرا بڑا نقصان ہو رہا ہے"

اب بابوجی اس کو جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھیں گے اور اپنے کام میں مصروف رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ کٹہرے کے باہر پہلے تو کچھ دیر تپائی پر بیٹھ کر اونگھے گا۔ اس کے بعد الہامی طور پر اس کے ذہن میں آئے گا کہ بابوجی کو پان کھلانا چاہئیں چنانچہ وہ فوراً پان لیکر پھر بابوجی کی خدمت میں حاضر ہوگا کہ "بابوجی ۔ یہ پان لے لو"!

بابوجی کی نظریں فوراً اس کی طرف اٹھ جائیں گی اور وہ پان لیتے ہوئے کہیں گے ۔"پان تو ابھی کھا رہا تھا۔ خیر لاؤ"

جب اہل معاملہ کے پان بابوجی کے منہ میں پہونچ جائیں گے تو وہ خود ہی اس سے کہیں گے:"اب کی تو ہولی ۔ دوالی سب گذر گئیں اور تم ہم کو بھولے ہی رہے"!

اہل معاملہ تاسف کے ساتھ کہے گا "کیا کہیں بابوجی کچھ ایسی ہی فکریں تھیں ۔ اب بڑے لڑکے کی شادی ہے جتنی چاہے مٹھائی کھانا"!

بابوجی کہیں گے" اب کی کیا کوئی باغ نہیں لیا ہے۔ کیا آموں کی فصل میں بھی سوکھا ہی رہے گا"!

اہل معاملہ کہے گا "نہیں بابوجی بھلا یہ کوئی بات ہے تمہارا باغ حاضر ہے جا ہے باغ چلو چاہے گھر پر منگالو آم"!

بابوجی آموں کا معاملہ پختہ کرنے کے بعد کہیں گے "یار سال تو خیر اچار ہی مل گیا تھا اب کی تو وہ بھی غائب ہی رہا سیٹھ جی تم روز بروز نیانے

ہوتے جاتے ہو!!

سیٹھ جی اچار کے سلسلہ میں اپنی کوتاہی کا عاجزانہ اعتراف کرنے کے بعد جب اچار بھیجنے کا وعدہ کرلیں گے تو بابو جی نہایت خلوص کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں ان سے پہلے تو کچھ مشورہ کریں گے اس کے بعد اگاہی پر روپیہ لینے کا تذکرہ چھیڑ کر اس بات کی کوشش کریں گے۔ کہ سیٹھ جی خود ہی اس کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ اگر سیٹھ جی ہوئے کوئی بدھو اور تیار ہو گئے تو اسی دن ان کا کاغذ ڈھونڈھ دیا گیا اور بابو جی خود ان کے زرخرید غلام نظر آنے لگے اور سیٹھ جی نے ٹال مٹول سے کام لیا تو آموں اور اچار کے وعدہ کے باوجود اور پانوں کے باوصف ان کا کاغذ کھٹائی میں پڑ گیا اور پھر وہ اس وقت ملے گا جب سیٹھ جی کے دوڑتے دوڑتے چلیتھڑے ہو جائیں۔

بہرحال کچھ بھی ہو بابو کی دفتری زندگی کے وقار اور ان کے بابوانہ اقتدار کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے اور ایسے ایسے خدا جانے کتنے اہل غرض دفتر میں بابو جی کے حضور ناک رگڑتے اور ہاتھ جوڑتے نظر آتے ہیں یہ اور بات ہے کہ خود بابو جی کو بھی اس دفتر میں بڑے بابو اور چھوٹے صاحب کے سامنے اسی قسم کی باتیں کرنا پڑتی ہوں۔

دفتر سے واپسی پر بابو جی کا حلیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بغل میں بستہ اور چھتری۔ سر پر کسی بے ڈھنگے زاویہ سے رکھی ہوئی ٹوپی ہاتھ میں رومال۔ باچھوں سے بہتا ہوا پان اور چہرہ پر دن بھر کی خستگی کے تمام

نقوش نمایاں مگر دماغ پر زور دے دے کر یہی سوچتے جاتے ہیں کہ بیو اُن نے دو پیسہ کے چقندر، دو آلو اور ایک پیسہ کے پانوں کے علاوہ اور کیا کہا تھا کہ لیتے آنا اس لئے کہ خیال یہ بھی ہے کہ اگر وہ چیز یاد نہ آئی تو گھر پہونچ کر پھر بازار آنا پڑے گا۔ مختصر یہ کہ شام کے قریب بابو جی لدے پھندے گھر پہونچتے ہیں۔ اور گھر پہونچکر پھر گھریلو افکار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ اب کی ہرگز مکاندار کو کرایہ اس وقت تک نہ دوں گا۔ جب تک کہ چھت نہ بنوا دے۔ تمام چھت ٹپکتی ہے اور اگر اس نے واقعی چھت بنوا دی تو کیا کرایہ دینا ہی پڑے گا۔ حالانکہ اگر اس مہینہ کرایہ نہ لیتا تو اچھا تھا اس لئے کہ جوتا بالکل ٹوٹ گیا ہے اور بیو اُن اپنے بھائی کے لڑکے کے مونڈن میں بھی جانا چاہتی ہے اس کا خرچ الگ ہے۔ لہذا ان تمام باتوں پر ایک ناریل پی کر غور کرنا چاہیئے۔ اور اگر کچھ سمجھ میں نہ آسکے تو روٹی کھا کر سو رہنا چاہیئے۔

اگر میں ہٹلر ہوتا

اگر میں یہ ہوتا اگر میں وہ ہوتا کے سلسلہ کی بہت سی تقریریں میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں نوبت یہاں تک پہونچی تھی کہ اگر میں گھوڑا ہوتا تو کیا کرتا مگر اس سے بھی آگے آج عرض کرنا یہ ہے کہ اگر میں ہٹلر ہوتا تو کیا کرتا۔ لظاہر ایک سیدھا سا سوال ہے اور جواب بھی چنداں مشکل نہیں۔ کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ میں اگر ہٹلر ہوتا تو مجکو بھی وہی کرنا پڑتا جو ہٹلر کو کرنا چاہیے۔ مگر ایسی صورت میں جبکہ ہٹلر خود ہی وہ باتیں کر رہے ہیں جو ان کو نہ کرنا چاہئیں۔ یہ سوال یقیناً غور طلب بن جاتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مجکو ڈکٹیٹری سے تو انکار نہیں اس لئے کہ میری موجودہ حیثیت سے ڈکٹیٹری بہر حال بلند چیز ہے مگر جب ہٹلر کی ڈکٹیٹری پر غور کرتا ہوں اور اپنے کو ہٹلر فرض کر کے ہٹلر کی موجودہ سرگرمیوں کا نقشہ اپنے پیش نظر لاتا ہوں تو اس سردی میں بھی پسینہ آجاتا ہے اور اپنی موجودہ کم حیثیتی اس ڈکٹیٹری کے مقابلہ میں بہت غنیمت نظر آتی ہے۔ وہ جو کسی ریڈر میں دیہاتی اور شہری چوہے کی کہانی پڑھی تھی اور جس سے یہ سبق سیکھا تھا کہ ؎

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر تو ہے
وہ ہے خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

یہی سبق اور یہی شعر اس موقعہ پر صادق آتا ہے۔ حالانکہ یہاں چوہے کا ذکر نہیں ہے۔ گفتگو ہے میری اور ہٹلر کی مگر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعر ہم دونوں کے متعلق نہیں ہے۔ بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر غور کیجئے تو ہٹلر اور اس خاکسار میں ہر اعتبار سے تو خیر زمین اور آسمان کا فرق ہے ہی مگر اس بنیادی اصول میں بھی اختلاف ہے ان کا قول ہے کہ "مرو اور اگر نہ مر سکو تو مجبوراً جیو" اور میں قائل ہوں کہ "جیو اور جینے دو" کا میرے یہاں سب سے مقدم زندگی ہے اور اس کے بعد کچھ اور۔ ان کا اصول غالباً یہ ہے کہ جب خود مرنا ہے ہی تو دوسروں کی زندگی کو بہ سکون کیوں رہنے دو۔ تو صاحب میں تو نہ اس خودکشی کا قائل ہوں نہ مجکو ان معظمہ سے اتفاق ہے جو خود کبڑی ہو کر دنیا بھر کے لئے کبڑا ہونے کی دعائیں کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ اس قسم کی ڈکٹیٹری اور اس قسم کے ہٹلر بننے کو تو بندہ دور ہی سے سات سلام کرتا ہے۔ البتہ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر ہٹلر خود ہٹلر نہ ہوتا بلکہ اس کی جگہ میں ہٹلر ہوتا تو کیا کرتا اس سوال کا اس رخ سے جواب دینے میں مجھے کوئی عذر نہیں۔

اگر میں ہٹلر ہوتا اور اتنے بڑے ملک کی ڈکٹیٹری مجھے حاصل ہوتی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی خواہ مخواہ کے دوسر

سیمٹتا نہ پھرتا۔ برلن کے عالیشان محل میں رہتا جس کے سونے اور کھانے
کے کمرے میری توجہ کے خاص مرکز ہوتے اور باہر لان پر بھی خدام دولت
ہر وقت منتظر رہتے کہ خدا جانے کس وقت ڈکٹیٹر صاحب ٹینس کھیلنے
کے لئے تشریف لے آئیں حالانکہ میں کبھی اپنے کو اس کا پابند نہ بناتا کہ
ٹینس کے وقت برج نہ کھیل سکوں۔ اوقات میرے پابند ہوتے نہ کہ
ڈکٹیٹر ہو کر اوقات کا میں پابند بنتا۔ آرام کی نیند سوتا اور دلچسپیوں میں
دن بسر کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنے فرائض کو خدانخواستہ
بھول جاتا اور حکومت کے تمام کام چوپٹ کر کے رکھ دیتا۔ جی نہیں ریشتاغ
کے اجلاس میرے زمانے میں بھی ہوتے اور میں بھی اپنے محل سے نکل کر
اپنی قوم کا سلام لیتا ہوا جلوس کی شکل میں ریشتاغ کی عمارت تک جاتا مگر
وہاں جا کر نوچ کھسوٹ کے مسائل پر غور کرنے کے بجائے اپنے ملک
جرمنی کو تمام دنیا کی آنکھوں کا تارا بنانے کی فکر کرتا کہ کس طرح دوسرے
ملکوں سے تعلقات خوشگوار بنائے جائیں۔ کیونکہ ہندوستان کو اپنی شرافت
کا قائل کیا جائے کس طرح فرانس سے دوستی کے پینگ بڑھائے جائیں
اور کون کون سی صورتیں اختیار کی جائیں کہ ساری دنیا کی زبان پر عزت
اور محبت کے ساتھ جرمنی کا نام آجائے۔ اس کے علاوہ خود اپنے
اہل ملک کے لئے ہٹلر کی طرح موت کے بہانے نہ ڈھونڈھتا پھرتا
بلکہ ان کو زندگی کے حقوق دیتا یہ فکر رکھتا کہ ان حقوق سے وہ خاطر خواہ
فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں یا نہیں۔ یہ نہیں کہ صحتیں خراب ہیں۔ پیٹ کو

روٹی نہیں جڑتی مگر ڈکٹیٹر صاحب کو تو صحت کی فکر ہے نہ زندگی کی
البتہ وہ ادھار کھائے بیٹھے ہیں اس پر کہ ہر وہ شخص جس میں کسی قسم کی زندگی
کے ذرا بھی آثار پائے جائیں۔ کندھے پر بندوق رکھے میدان جنگ
کی طرف جاتا ہوا نظر آئے۔ ورنہ اس کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔
گویا زندہ رہے تو مرنے کو جائے ورنہ اس سے بہتر ہے کہ زندہ ہی نہ رہے
کھیتیاں ویران پڑی ہیں اور اسلحہ سازی کے کارخانے دن رات
چل رہے ہیں۔ پیٹ میں اناج پہونچے یا نہ پہونچے مگر کارتوسوں میں
بارود ضرور بھر جائے۔ زندگی اور صحت کی تدابیر پر غور کرنے والے
سائنس داں زہریلی گیس۔ موت کی شعاع اور اس قسم کی ہلاکت آفریں
تدابیر پر غور کریں۔ کام ہے ان کا مرنے والوں کو موت سے بچانا
اور سپرد ہے ان کے جینے والوں کو مارنے کا کام۔ تو صاحب اس
خاکسار سے تو یہ حرکتیں قیامت تک سرزد نہ ہو سکتیں۔ میں اپنی
قوم کو جان بوجھ کر ہلاکت اور بربادی کی طرف یوں کبھی نہ جھونکتا جس
طرح ہٹلر صاحب مشق ستم فرما رہے ہیں اگر شیطان کے کان بہرے میرا
بھی دماغی توازن اسی طرح گڑبڑ ہو جاتا تو میں ڈکٹیٹری چھوڑ کر پہلے اپنا
علاج کراتا اس کے بعد ملک اور قوم کے معاملات میں دخل دیتا۔
کوشش کر رہا ہوں کہ جو کچھ مجھکو عرض کرنا ہے اس میں موازنہ کی کیفیت
پیدا نہ ہو مگر عجب مصیبت یہ ہے کہ

بنتی نہیں کسی طرح ہٹلر کہے بغیر

لہٰذا اب یوں کہتا ہوں کہ اپنی جان سے دور اگر میں ہٹلر ہوتا تو اپنے ساتھ اپنی قوم کی زندگی اس بوکھلاہٹ کے ساتھ موت کے سپرد کبھی نہ کرتا بلکہ یقین جانیے کہ زندہ رہ کر دوسروں کو زندہ رکھتا اور جو کام جرمنی کے یہ خداوند نعمت صاحب توپ کے گولوں سے لے رہے ہیں وہ کام میں اپنے ہمسایوں سے اخلاق اور مروت سے لے لیتا تخفیف اسلحہ کی تحریک اول تو میرے ہی دماغ کا نتیجہ ہوتی ورنہ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ اس تحریک کا سب سے بڑا حامی میں خود ہوتا۔ یہ نہیں کہ تخفیف اسلحہ کے پردہ میں جنگی تیاریاں شروع کر کے دوسروں سے یہ جھوٹ بولتا کہ یہ سب کچھ تو محض اپنے بچاؤ کے لئے ہے اور اس کے بعد جب کیل کانٹے سے اپنے نزدیک درست ہو جاتے تو بے بات کی بات پیدا کر کے میدان میں آ کودتا۔ لاحول ولا قوۃ پھر وہی موازنہ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ حالانکہ غرض صرف یہ کرنا ہے کہ ہٹلر سے کوئی مطلب نہیں اگر میں خود ہٹلر ہوتا اور جو ہٹلر ہیں وہ ہوتے ہی نہیں تو کیا صورت ہوتی اور میں کس قسم کا ہٹلر ثابت ہوتا۔ اس سلسلہ میں فوراً میرا تفصیلی پروگرام سن لیجئے کہ میرا وقت کیونکر گزرتا اور میری نقل و حرکت کا مفہوم کیا ہوتا۔ غالباً اس سے میری پالیسی کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے گا۔

برلن کے عظیم الشان محل میں بحیثیت ڈکٹیٹر کے جب صبح میں بیدار ہوتا تو محل میں تعینات فوجی دستہ میری سلامتی کا ترانہ گاتا اور حجام انچیف رد بکار دئی خاص چند برقی شعاعوں سے جو ہلاکت آفریں نہیں بلکہ دہ شیو

آفریں" ہوتیں فیلو بنانے کا اعزاز حاصل کرتا اس کے بعد ہی افسیر انچارج حمام خاص احکام غسل حاصل کرنے کے لیے باریاب ہوتا مختصر یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں مجھ عظیم المرتبت شخصیت کو ان ضروریات سے فراغت حاصل ہو جاتی اور میں صبح کے شاہانہ ناشتہ کے ساتھ ہی ذمہ داران حکومت کو شرف باریابی بخشتا تاکہ وہ اپنے اپنے محکمہ کی خیریت سنائیں اور میں ان کو ضروری احکام دے کر رعایا کی فلاح کے غرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ مشیران حکومت کو جلد جلد ضروری ہدایات دے کر رخصت کرتا اور اس کے بعد پوسٹ ماسٹر جنرل ڈاک خانہ برلن میرے نام کی ڈاک لے کر حاضر خدمت ہوتا۔ اس ڈاک میں مختلف، حکومتوں کے تاجداروں اور ڈکٹیٹروں کے دوستانہ خطوط اور تار وغیرہ ہوتے خود میری رعایا کی عرضداشتیں ہوتیں کچھ اخباروں کے وی پی ہوتے کچھ سربستہ راز منی آرڈروں کی رسیدیں ہوتیں کسی ڈکٹیٹر کا خط کھولتا تو اس کو اپنی خیریت نہ پہونچنے پر بے قرار پاتا۔ کسی بادشاہ نے اپنی دختر نیک اختر کی شادی کے سلسلہ میں مجھ سے مشورہ طلب کیا ہوتا۔ کسی حکومت کے نمائندہ نے مجھ سے شکایت کی ہوتی کہ دیکھئے صاحب فلاں فلاں حکومت۔ نے ہمارے فلاں فلاں گاؤں میں اپنے مویشی چرانے کے لئے بھیج دیے ہیں اور ہم کو اندیشہ ہے کہ ان مویشیوں کے بعد ان کے چرواہے آئیں گے اور چرواہوں کی تلاش میں ان کے رشتہ دار نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی طرح ان کی فوج ہماری مملکت میں آجائے گی۔ اس سلسلہ میں ہم آپ کو ثالث مقرر کرتے ہیں۔ آپ ان کو سمجھائیے کہ یہ طریقہ اس تہذیب

دشمن کے دور میں صلح و امن کے خلاف ہے۔ اس طرح کے مختلف پیغامات اس ڈاک میں نکلتے اور میں ڈاک دیکھنے کے بعد پوسٹ ماسٹر جنرل کو رخصت کرتا اور ڈاک کے ایک ایک تار اور ایک ایک خط کا جواب خود لکھتا یا اپنے پرائیوٹ سکریٹری سے لکھواتا۔ ہر ایک کو پرخلوص جواب اور آخر میں اشتیاق ملاقات۔ مویشیوں کی مداخلت بیجا کی شکایت ——— کرنے والے ڈکٹیٹر کو اپنے پاس آنے کا دعوت نامہ یا خود موقعہ پر پہونچنے کی اطلاع دیتا تاکہ دونوں حکومتوں کے ذمہ داروں کو فوراً گلے سے لگا دیا جائے مختصر یہ کہ اسی قسم کی صلح جویانہ تدابیر خود بھی اختیار کرتا رہتا اور دوسروں کو بھی ان کی ترغیب دیتا بلکہ اگر خود میری مملکت میں کسی اور ہمسایہ ملک کے مویشی آجاتے اور مجکو ان کی آمد کی اطلاع ملتی تو میں ان کے استقبال کا حکم دیتا اور میری ہدایت ہوتی کہ نہ صرف ان کو شوق سے جرمنی کے کھیت چرنے کی اجازت دے دی جائے بلکہ ان کو ان کھیتوں کی طرف ہنکا دیا جائے جن میں ان کے مرغوب ترین چارے کے سامان موجود ہوں اس کے بعد جس مملکت کے وہ مویشی ہوتے اس کو شکریہ کا ایک خط بھیجتا کہ آپ کی اس بے تکلفی سے دلی مسرت حاصل ہوئی کہ آپ نے اپنے مویشیوں کے لئے جرمنی کو خانہ بے تکلف سمجھا۔ آپ کے مویشی ہمارے مہمان ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ میزبانی کے فرائض کچھ دن اور ادا کریں۔ بات تو یہ چھوٹی ہوتی مگر اس کا اثر کتنا پڑتا کیا پھر وہ حکومت کسی وقت بھی میری حکومت سے دشمنی کا ارادہ اپنے ذہن میں لاسکتی

میرے خیال میں تو ہرگز نہیں آپ کہیں گے کہ سب کہنے کی باتیں ہیں، جس وقت ضروریات مجبور کرتیں مجھکو بھی نصیب دشمناں ہٹلر کا رویہ اختیار کرنا پڑتا۔ مثلاً میری حکومت میں خام اشیاء کی کمی ہوتی اس وقت زندگی سے بیزار ہو کر آخر میں کیا کرتا۔ یہی نا کہ ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ تو صاحب اس سے مجھکو کب انکار ہے کوشش نہ کی جائے مگر کوشش کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ جو چیز اپنے پاس نہیں ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے زبردستی شروع کردی جائے در اصل اس کا آسان طریقہ میری حکومت میں یہ ہوتا کہ فرض کر لیجئے میری حکومت کو پٹرول کی ضرورت ہوتی اور میں دیکھتا کہ رومانیہ کے پاس پٹرول کافی ہے تو میں فرانس سے پٹرول چھیننے کے بجائے رومانیہ کو ایک دوستانہ خط لکھتا۔

برادر بجان برابر۔ اپنے ہٹلر کا سلام قبول کرو اب تو خیریت کے دو لفظوں کے لئے ترس گئے۔ خیر صاحب آپ نہ پوچھئے مگر ہم تو ہر وقت دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ بھائی چرچل کے خط سے خیریت معلوم ہو ہی جاتی ہے۔ اس وقت ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شاید آپ کو جرمنی میں پٹرول کے قحط کی اطلاع ابتک نہ ہوئی ہوگی ورنہ مجھکو یہ عریضہ لکھنے ہی کی ضرورت نہ ہوتی امید ہے کہ آپ پٹرول مہیا کرنے کے لئے اسی وقت احکامات صادر کر کے شکریہ کا موقعہ دیں گے۔ جرمنی کی تمام مصنوعات آپکی

ہیں اور آپ کو میری ہی قسم جو کسی معاملہ میں کبھی تکلف کریں

اور باقی سب خیریت ہے۔ بچے آداب عرض کرتے

ہیں۔ سب خورد و کلاں کو حسب مراتب سلام و دعا۔

بندۂ خلوص احقر۔ ہٹلر

کیوں صاحب کیا اس خط کا اثر نہ ہوتا۔ اور کیا اس قسم کے باہمی تعلقات کے بعد بھی توپ اور بندوق کی ضرورت ہوتی سچ پوچھئے تو اس لڑائی جھگڑے کی ضرورت تو اس لئے پیش آ رہی ہے کہ جنگجو ہٹلر صاحب اپنے سوا کسی اور کو دیکھنا ہی نہیں چاہتے حالانکہ قدرت کا ایک مقررہ اصول یہ ہے کہ چیونٹی کی موت اسی وقت آتی ہے جب اس کے پر نکل آتے ہیں اگر وہ محض رینگتی رہے جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ اڑنے کی کوشش کرتی ہے اور یہی اس کی موت ہے۔ میں تو زندہ رہنے کے لئے رینگتا ہی رہتا اور مرنے کے لئے اڑنے کی کوشش کبھی نہ کرتا جب صلح میرا اصول ہوتا اور ہر ایک سے دوستی میرا شعار تو ظاہر ہے کہ بلاوجہ مجھ سے دشمنی کون کرتا اور فرض کر لیجئے کہ اگر اس صلح جوئی اور امن پسندی کے باوجود دس وغیرہ "آؤ بڑے سن لڑیں" کی دعوت بھی دیتے تو میرے جاں نثار دوست اور میرے غمخوار ہمسائے سب میری مدد کو ہر وقت موجود رہتے اس لئے کہ میں خود ان سب کا غمخوار اور ہمیشہ کام آنے والا دوست ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ جنگ کے امکانات "تقریباً" نہ ہونے کے برابر ہوتے اور جنگی گتھیاں سلجھانے والا دماغ رعایا کی فارغ البالی

اس کی صحت اور تندرستی کے امکانات کی جستجو میں رہتا خود بھی سکون حاصل رہتا رعایا بھی امن چین سے زندگی بسر کرتی. ہمسائے بھی خوش اور دوسری حکومتیں بھی مطمئن بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر میرے ماتحت مثلاً گورنگ، گس اور غیرہ کہتے بھی کہ سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے گا تو میں ان کو ڈانٹ دیتا کہ گھی نہیں نکلتا تو تیل کھاؤ۔ مگر انگلیاں کیوں ٹیڑھی کرو بات صرف اس قدر ہے کہ خود ہٹلر صاحب ہی مجھکو یہ سمجھا دیں کہ موت حاصل کرنا خواہ وہ اپنے لئے ہو یا کسی کے لئے کونسا اعجاز ہے وہ جو ایک شعر ہے سے

کوئی دیکھے ان کی دزدیدہ نگاہی کا فریب

کوئی پوچھے جان لینا کونسا اعجاز ہے

کمال تو ہے زندگی کی راہیں ڈھونڈھنا. مرنے اور مارنے کا طریقہ تو ہٹلر صاحب کیا وحشی بھی جانتے تھے اور جنگل کے درندے بھی جانتے ہیں۔

برلن کا اسپتال

(شیشیاں رکھنے دوائیں انڈیلنے اور مریضوں کے کراہنے کی آوازیں۔ ڈاکٹر صاحب نرس کو آواز دیتے ہیں)

ڈاکٹر:۔ نرس۔ نرس (گھنٹی بجاتا ہے) بوائے بوائے"

بوائے۔ حضور۔

ڈاکٹر۔ دیکھو نرس مس صاحبہ کو سلام بولو"

(نرس خود ہی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی آتی ہے۔)

نرس:۔ گڈ ایوننگ ڈاکٹر"

ڈاکٹر۔ گڈ ایوننگ مس۔ نمبر ۱ کا کیا حال ہے۔

نرس۔ اوہ۔ اس کو انجکشن سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ اب تک یہی بکتا ہے کہ نازی خونخوار ہیں۔

ڈاکٹر۔ ایک انجکشن اور دیا جائے گا اور نمبر ۲ اب ٹھیک ہے۔

نرس۔ اس کو ۳ ڈوز دیئے گئے مگر اس کا دماغ ابھی تک گڑبڑ ہے وہ بولتا ہے کہ جرمنی وحشیوں کو مات کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر۔ اور وہ جس مریض کا کل آپریشن ہوا تھا؟"

نرس ۔ وہ آج صبح مر گیا اور مرتے مرتے یہی کہتا رہا کہ پاگلوں کی طرح لڑنے سے اس طرح کا مرنا اچھا ہے ۔

ڈاکٹر ۔ اس کا مرنا ہی اچھا ہوا اس نے ایک جلسہ میں تقریر کی تھی کہ اگر نازی سپاہی اس جنگ سے باز نہ آئے تو جرمنی یورپ کے نقشہ سے اڑ جائے گا ۔ وہ پاگل تھا ۔ بالکل پاگل ۔ اچھا بوائے نئے مریضوں کو بلاؤ اور نرس دیکھو ہم مریضوں کو دیکھنے کے بعد راؤنڈ کریں گے ۔

نرس ۔ بہت اچھا ۔

(نرس جاتی ہے)

بوائے ۔ حضور پولیس ایک مریض کو لائی ہے اور چار پانچ مریض جیل کی لاری پر آئے ہیں ۔

ڈاکٹر ۔ سب کو ایک ایک کر کے بلاؤ ۔ پہلے وہ پولیس والا مریض ۔

بوائے ۔ ادھر آؤ ۔ یہاں کھڑے ہو ۔

(زنجیروں کی آواز اور قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر ۔ تمہارا نام ؟

مریض ۔ جان ۔

ڈاکٹر ۔ باپ کا نام ؟

مریض ۔ جیک ۔

ڈاکٹر ۔ عمر

مریض ۔ ۲۵ سال

ڈاکٹر ۔ تم کیا بیمار ہو ۔؟

مریض ۔ میں بالکل تندرست ہوں ۔ مجھے کوئی شکایت نہیں میری صحت بالکل اچھی ہے ۔

ڈاکٹر ۔ پھر تم کو پولیس نے مریض کیونکر سمجھا ۔

مریض ۔ مرض سمجھنا اگر پولیس کا کام ہے تو چالان کرنا ڈاکٹروں کا کام ہونا چاہئے ۔

ڈاکٹر ۔ اوہو ۔ ہم یہ نہیں پوچھتے ۔ ہمارے سوال کا جواب دو تم کو مریض کیونکر سمجھا گیا ۔

مریض ۔ یہ سمجھنے والوں سے پوچھا جائے جن کا خیال ہے کہ میرا دل کمزور ہے اور دماغ بھی خراب ہے ۔ حالانکہ میں نے صرف فوج میں بھرتی ہونے سے اس لئے انکار کیا تھا کہ میرے نزدیک نازی حق پر نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ وہ صرف امن کو ختم کرنا چاہتے ہیں ۔

ڈاکٹر :۔ تمہارا یہ خیال کب سے ہے ۔ یعنی تم کب سے ایسی باتیں سوچنے لگے ہو ۔

مریض ۔ جب سے نازی پارٹی نے زبردستیاں شروع کی ہیں ۔

ڈاکٹر ۔ ہوں تمہارے یہاں کسی اور کو بھی یہ مرض ہوا ہے ؟

مریض ۔ مرض ؟ مرض کیسا ۔ یہ مرض ہے کہ میں ایک انصاف کی بات کہہ رہا ہوں ۔

ڈاکٹر۔ یہی مطلب ہے کہ تم کو یہ انصاف کب سے ہو گیا ہے۔

مریض۔ مجھے ہمیشہ اپنی ذات پر انصاف پسند اور حق گو ہونے کا فخر رہا ہے۔

ڈاکٹر۔ آئی سی (سمجھو) تم انصاف کے علاوہ حق گوئی میں بھی مبتلا ہو۔ اچھا تم اسپتال میں رہ کر علاج کرو۔ تم کو آرام ہو سکتا ہے مگر سخت پرہیز کرو۔ تمہارا انصاف بھی ٹھیک ہو جائے گا اور حق گوئی بھی جاتا رہے گا۔ وارڈ بوائے اس کو لیجاؤ۔ اور اس مریض کو لاؤ۔

بوائے۔ (باآواز بلند) جیل وارے مریض کو لاؤ۔

(زنجیروں کی آواز اور قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر۔ اس کو کیا ہوا ہے۔

بوائے۔ حضور اس کی آنکھیں خراب ہیں۔

دوسرا مریض۔ میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں، میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ اسپتال ہے یہ گھڑی لگی ہے اس میں آٹھ بج کر ۳ منٹ آئے ہیں۔ یہ ڈاکٹر ہیں ان کا یہ چشمہ ہے۔

ڈاکٹر۔ پھر تمہاری آنکھ میں اور کیا خرابی ہے۔

دوسرا مریض۔ کوئی خرابی نہیں۔ میری آنکھوں میں اچھی خاصی روشنی ہے مجھے کبھی چشمہ تک کی ضرورت نہیں ہوئی۔ میں فاصلے کی چیزیں بھی دیکھ سکتا ہوں اور نزدیک کی بھی۔ مہین سے مہین چھاپے کی عبارت پڑھ سکتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ یہ تو سب ٹھیک ہے مگر پھر کیا بات ہے؟

بوائے۔ حضور رپورٹ یہ ہے کہ اس نے دشمنوں کے فوجی افسر کی تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ یہ صورت سے شریف اور راہ راست پر معلوم ہوتا ہے اور ہمارے کمانڈر کی تصویر دیکھ کر کہا کہ ظلم صورت سے برستا ہے۔

ڈاکٹر۔ اوہو۔ یہ تو بہت بڑی آنکھوں کی بیماری ہے۔ آنکھوں کی پتلیوں نے غلط چیزیں دیکھنا شروع کر دی ہیں اور یہ اندھے ہو جانے کی علامت ہے۔ تمہاری آنکھیں کبھی دکھنے آئی تھیں

دوسرا مریض۔ بچپن کے علاوہ کبھی نہیں۔

ڈاکٹر۔ کسی غیر ملکی کوئلہ کی کان کا کوئلہ ریل وغیرہ میں تمہاری آنکھ کے اندر کبھی پڑا۔؟

دوسرا مریض۔ کبھی نہیں۔ اور اگر پڑا ہو تو یاد نہیں۔

ڈاکٹر۔ تمہارے سر میں کبھی درد ہوتا ہے۔؟

دوسرا مریض۔ عام طور پر نہیں۔

ڈاکٹر۔ اچھا اپنی زبان دکھاؤ۔ اور۔ اور ٹھیک ہے۔ کیا تم نے اپنے افسر کی تصویر دیکھ کر ظالم سمجھا؟

دوسرا مریض۔ میں اس کو ظالم سمجھتا ہوں۔ وہ قوم کو تباہی کی طرف لے جانے والوں میں سے ایک ہے۔ وہ امن و امان کے دشمنوں کا ساتھی ہے۔ اس کی تصویر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیل کی رپورٹ غلط ہے تمہاری

صرف آنکھیں ہی نہیں دل و دماغ بھی خراب ہے۔ آنکھوں کا تو صرف ایکسس (AXIS) بدل گیا ہے مگر دماغ الٹی بات سمجھتا ہے اور دل بھی کمزور ہے۔

(نرس دوڑتی ہوئی آتی ہے)

نرس۔ وہ مریض جو ابھی پولیس لائی تھی لیٹنے سے انکار کرتا ہے اور وارڈ کے دوسرے مریضوں کو لیکچر دے کر اپنے جراثیم پھیلا رہا ہے۔

ڈاکٹر۔ لیکچر دیتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی زبان پر بھی زہر پھیل گیا ہے۔ اس کو آپریشن تھیٹر میں لے چلو۔ میں اس مریض کو دیکھ کر ابھی آتا ہوں۔

دوسرا مریض۔ کیا اس کی زبان کاٹی جائے گی؟

ڈاکٹر۔ اس کی جان بچانے کے لئے جسم کے بیکار اور زہریلے حصّہ کو کاٹ ڈالنا ہی پڑے گا۔

دوسرا مریض۔ بیچارے کی زبان۔ اس کی زبان میں کیا خرابی ہے۔

ڈاکٹر۔ نازی پارٹی کے خلاف لیکچر دیتا ہے اس سے بڑھکر اور خرابی کیا ہوگی۔ اگر اس کی زبان فوراً نہ کاٹی گئی تو نہ صرف وہ تباہ ہو جائے گا بلکہ اس کی چھوت بہت سے تندرستوں کی صحت خراب کر دے گی۔ اگر کسی مریض کا ہاتھ سڑ جائے تو باقی جسم کو بچانے کے لئے ہاتھ کاٹ ڈالنا چاہئے اسی طرح اس کی زبان کاٹنا پڑے گی۔

دوسرا مریض۔ تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ ظالمانہ چارہ گری سچ بولنے والوں کو سچائی سے انصاف پسندی کے حامیوں کو انصاف سے امن پسندی

کے طرفدار دں کو امن سے باز رکھے گی۔

ڈاکٹر۔ یہ سب بہت خطرناک بیماریاں ہیں ہم نے ان بیماریوں کی روک تھام کے لئے نئے نئے آپریشن اور عجیب و غریب انجکشن اور دوائیں ایجاد کرلی ہیں جن کا بہت جلد اور بہت اچھا اثر مریض پر ہوتا ہے سچ بولنے والے بہت سے مریض جھوٹ کے عادی ہو گئے۔ ایک معمولی انجکشن نے بہت سے ایمان داروں کو ایمان داری کا دشمن بنا دیا۔ بہت سے انصاف پسندی کے مریض ہماری دوا کی دو تین خوراکوں کے بعد انصاف کے نام کو بھول گئے اور سب سے بڑا اور عام مرض انسانیت تو ہم نے اینٹی ہیومن ویکسی نیشن یعنی (Anti Human vaccination) انسانیت کش ٹیکہ سے ایسا کھویا ہے کہ ہماری نازی فوج میں یہ مرض نام کو بھی نہیں۔

دوسرا مریض۔ کیا مطلب یعنی تم انسانیت کے بھی دشمن ہو۔

ڈاکٹر۔ تم بہت بھولے ہو۔ جب تک یہ کمزوری ہم میں سے دور نہ ہو اس وقت تک ہم جنگجو نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہم نازی بچوں بڈھوں جوانوں مردوں اور عورتوں سب کو صرف چیچک۔ طاعون اور ہیضہ ہی کے ٹیکے نہیں لگاتے بلکہ یہ ٹیکہ بھی لگاتے ہیں کیا تمہارے یہ ٹیکہ نہیں لگا ہے

دوسرا مریض۔ نہیں میں برلن کا رہنے والا نہیں ہوں دیہات سے یہاں آیا ہوا تھا۔

ڈاکٹر۔ مگر ہمارے ویکسی نیٹر (Vaccinator) تو دیہاتوں میں بھی گھوم رہے ہیں اور جنگ کے زمانے میں تو اس وبا کو ہم اپنے ملک میں

رکھ ہی نہیں سکتے۔ تمہارے سب سے پہلے یہ ٹیکہ لگنا چاہیئے۔

دوسرا مریض۔ دگھرا کر) نہیں نہیں میں ہرگز اپنی انسانیت سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر۔ کوئی تکلیف نہ ہوگی تم چپ رہو۔ بوائے فوراً ٹیکہ کا سامان لاؤ۔

دوسرا مریض۔ نہیں ڈاکٹر صاحب مجھے زہر دیدیجئے، مجھے مار ڈالیے میں انسان پیدا ہوا ہوں انسانیت میرا حق ہے میں انسانیت کو کھو کر زندہ رہنا نہیں چاہتا

ڈاکٹر۔ تم میں انسانیت کے بہت سے جراثیم ہیں۔ تم فوراً ٹھیک ہو جاؤگے گھبراؤ نہیں یہ ویکسی نیشن vaccintoin تم کو بہت جلد انسانیت سے دور کر دے گا۔ تم انسانیت کا جامہ اتار پھینکوگے۔ یہ بہت عمدہ چیز ہے اس میں شیر اور دوسرے درندوں کا ست ہے اور پاگل کتے جو ہم بڑی مشکل سے مہیا کرتے ہیں ان کا جوہر اس انجکشن میں موجود ہے vaccination

دوسرا مریض۔ میں درندہ بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں پاگل کتوں کی طرح بھونکنا نہیں چاہتا۔ میں انسان ہوں مجکو انسان رہنے دو۔

ڈاکٹر۔ کوئی فکر کی بات نہیں، تمہاری ساری انسانیت رگ رگ سے کھینچکر چھوٹے سے زخم کی صورت میں باز دپر آجائے گی زخم تھوڑے دنوں میں سوکھ جائے گا اور انسانیت کھرنڈ بنکر جھڑ جائے گی۔ اس کے بعد تم اعلیٰ درجہ کے نازی سپاہی ہو جاؤگے تم کو وار اسپرٹ مکیچر War spirit Mixture کی دو تین خوراکیں بہت بڑا جنگجو بنا دیں گی۔

(قدموں کی چاپ)

بوا ے :۔ ٹیکہ کا سامان درست ہے ۔

دوسرا مریض ۔ مجھے چھوڑ دو یا گولی مار دو میں انسان ہوں ، انسان رہنا اور انسان ہی رہ کر مرنا چاہتا ہوں ۔

ڈاکٹر ۔ مت بکو یہ سب انسانیت کا قصور ہے کہ تم جنگجو بننا اور انسانیت کے خلاف جنگ میں حصہ لینا نہیں چاہتے ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم کو بالکل انسان نہ رہنے دیں گے تم سچے نازی بن جاؤ گے صورت شکل آدمیوں کی سی ہو گی مگر درندوں کی طرح پھاڑ کھانے کی اسپرٹ پیدا ہو جائے گی ۔ تم سچ ، انصاف ، ایمانداری ، رحم دلی شرافت اور اسی قسم کی بہت سی چھوٹی چھوٹی بیماریوں سے بچ جاؤ گے چلو ادھر ___"

دوسرا مریض :۔ نہیں ڈاکٹر مجھے چھوڑ دو ۔ خدا کے لئے چھوڑ دو ۔

(نرس کے قدموں کی چاپ)

نرس :۔ ڈاکٹر وہ مریض آپریشن تھیٹر میں ہے ۔

ڈاکٹر ۔ میرا خیال ہے اس کے بھی ٹیکہ نہیں لگا ہے ، پہلے اس پر بھی ٹیکہ کا امتحان کیا جائے ۔ اچھا ان کو ٹیکہ لگانے کے بعد دیکھا جائے گا ۔

دوسرا مریض ۔ میں یہ ٹیکہ جانور بنا دینے والا نہیں لگوا سکتا ۔

ڈاکٹر ۔ نہیں تم جانور نہیں بن سکتے ۔ ہمارا ذمہ ہے کہ دم نہیں نکلے گی چلو بڑھو ادھر ___"

دوسرا مریض ۔ (رونی آواز میں) ڈاکٹر صاحب مجھے چھوڑ دیجئے ۔

نرس۔ ہم۔

میں بالکل اچھا ہوں میں ٹیکہ نہیں لگواؤں گا۔

ڈاکٹر۔ اس کو پکڑو بوائے۔ نرس تم ٹیکہ کا سامان سنبھالو۔

دوسرا مریض (چیخ کر) ارے مار ڈالا۔ میری انسانیت ختم کر دی

(زور سے) آہ۔ آہ۔

ڈاکٹر۔ بس بس۔ بوائے اس کو آرام سے لٹا دو۔ یہ بیہوش ہو رہا ہے۔

نرس۔ اور وہ مریض؟

ڈاکٹر۔ ہاں اب اس کو لاؤ۔ اس کے بھی ٹیکہ لگا دیا جائے۔

(نرس جاتی ہے)

بوائے۔ اس نے تو آنکھیں بند کر لیں۔

ڈاکٹر۔ ٹیکہ اثر کر رہا ہے۔ ایک گھنٹہ تک اس کو بیہوش رہنا چاہئے۔

اس کے بعد ہوش میں آتے ہی اس کو ایک خوراک وار اسپرٹ مکسچر War

Spirit Mixture کی دیدی جائے۔

بوائے۔ کل جو مریض آئے تھے آج وہ سب بالکل ٹھیک ہیں

اس مکسچر نے سب کو بہادر نازی بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر۔ یہ مریض بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور جو مریض ٹھیک ہو گئے

ہیں ان کو فوراً چھاؤنی بھجوا دو۔

(قدموں کی چاپ زنجیروں کی آواز)

نرس۔ دیکھو خاموش چلے آؤ ہم تم کو بالکل اچھا کرنا چاہتے ہیں تم

بہادر نازی بن جاؤ گے۔

مریض ۔ خونخوار بنانا چاہتی ہو ۔ درندہ بنانا چاہتی ہو جو انصاف حق وصداقت امن اور آدمیت کے خلاف جنگ کرے ۔

ڈاکٹر ۔ چپ رہو ہم ابھی تمہاری یہ سب تکلیفیں دور کر دیں گے ادھر آؤ آگے بڑھو ۔

مریض ۔ یہ ظلم ہے ۔ میری مرضی کے خلاف تم میری فطرت بدل رہے ہو ۔ تم جرمنی کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہو ۔

ڈاکٹر ۔ چپ رہو ۔ شور نہ مچاؤ ۔ تم ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے ۔ تمہارے کبھی ٹیکہ لگا ہے ۔

مریض ۔ لگا ہے ۔ چیچک اور طاعون دونوں کا لگا ہے ۔ ہیضہ کا ٹیکہ نہیں لگا ۔ اس لئے کہ میں خود ہی تحاقے کرتا ہوں ۔

ڈاکٹر ۔ نہیں نہیں ۔ تم نہیں سمجھے ۔ نازی بنانے کا ٹیکہ لگا ہے تمہارے ؟

مریض ۔ میں یہ کلنگ کا ٹیکہ کبھی نہ لگنے دوں گا ۔ تم نے ساری قوم کا ناس مارا ۔ جرمنی کو درندوں کا جنگل بنا کر رکھ دیا اور انھیں درندوں کا شکار کھیلنے کے لئے دنیا کو مجبور کیا ہے ۔

ڈاکٹر ۔ نہیں لگا ہے اس کے ٹیکہ اور یہ سب اسی کی خرابی ہے ہمارے دیہی نیٹر Vaccinator جانے کیوں سو رہے ہیں ان کو حکم ہے کہ کوئی جرمنی کا باشندہ بغیر ٹیکہ کے نہ رہنے پائے اس کو پکڑ لو ۔

مریض ۔ یہ ظلم ہے (بلند آواز سے) زبردستی ہے (اور زیادہ بلند آواز سے) بربریت ہے ۔

ڈاکٹر۔ یہ سب باتیں یہ ٹیکہ پیدا کر دے گا۔ اطمینان رکھو۔ بوائے اس کو آگے بڑھاؤ۔

مریض۔ ارے میں مر جاؤں گا۔ ارے ڈالا۔ اف۔ آہ۔

ڈاکٹر۔ بس ٹھیک ہے۔ لٹا دو اس کو آرام سے۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی)

ڈاکٹر۔ بوائے ٹیلیفون سنو۔

بوائے۔ (ٹیلیفون رسیور اٹھا کر) برلن ہاسپٹل۔ کہاں سے ریشتاغ اچھا اچھا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔ کون۔ جنرل وان ڈف۔ ہاں۔ ہاں۔ ابھی ابھی۔ کہتا ہوں۔ او کے (OK)

(رسیور رکھنے کی آواز)

ڈاکٹر۔ کون تھا۔

بوائے۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) نازی ملٹری سکریٹری کے پرائیوٹ سکریٹری کا فون ہے۔ ریشتاغ میں ایک دم جنرل وان ڈف پر دورہ پڑا ہے سب ان کو سنبھالے بیٹھے ہیں اور وہ بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ صلح کر لینا چاہیے۔ انہوں نے صلح کرنے کے حق میں بہت بڑی تقریر کی ہے۔ آپ کو فوراً وہاں طلب کیا ہے۔

ڈاکٹر۔ صلح کا دورہ پڑا ہے۔ اچھا ہینڈ بیگ انجکشن کا سامان وار اسپرٹ مکسچر کے تین چار ڈوز فوراً موٹر پر رکھو اور ان مریضوں کو دیکھتے رہو۔ ہوش میں آتے ہی مکسچر دیا جائے گا۔ میں جنرل ڈف کا علاج کر کے

ابھی آتا ہوں۔ صلیح کا دورہ (بڑھتا ہوا جاتا ہے) صلیح کا دورہ خطرناک بات ہے۔ (قدموں کی چاپ غائب ہو جاتی ہے اور موٹر روانہ ہونے کی آواز آتی ہے)

نرس ۔ وارڈ بوائے ۔ وارڈ بوائے ۔

(گھنٹیاں اِدھر اُدھر بجنے اور وارڈ بوائے چلنے کی آواز)

بوائے ۔ (آکر) مس صاحبہ مجکو پکارا تھا ۔

نرس ۔ دیکھو تم مریضوں کو دیکھتے رہو ۔ ہوش آنے ہی والا ہے یہ مکسچر فوراً پلانا ہوگا ۔

بوائے ۔ مس صاحبہ وہ دیکھئے آنکھیں کھول رہا ہے ۔

نرس ۔ اور یہ مریض بھی منہ چلا رہا ہے ۔ (ذرا بلند آواز میں) کیسا ہے تم؟

مریض ۔ (پاگلوں کی طرح ہنس کر) مارو ۔ مارو (پھر خوفناک ہنسی ہنس کر) مارو ۔ مارو ۔ اور ۔ اور ۔ (قہقہہ)

نرس ۔ بوائے فوراً مکسچر دو ۔ ٹیکہ کامیاب رہا ۔ اب اس کا دماغ ٹھیک ہے ۔

بوائے ۔ لو اسے پی لو ۔ اے جی سنتے ہو ۔ اسے پی لو ۔

مریض (پاگلوں کی طرح ہنس کر) تم بھی مارو ۔ اڑا دو ۔ (ہنسنا)

بوائے ۔ اسے پی جاؤ ۔ بہادر نازی ۔ جلدی سے پی لو ۔

مریض ۔ پی لو ۔ پی لو ۔ (ہنستا ہے) لاؤ ۔ پلاؤ ۔ بیو ۔ پی لو (ہنستا ہے)

نرس ۔ بہت عمدہ ۔ بہت اچھا اثر ہوا ہے بالکل ٹھیک ہو گیا یہ مریض

بوائے دیکھو دوسرا مریض انگڑائی لے رہا ہے اس مریض کو ہٹا دو نہیں تو دونوں آپس میں لڑ بڑیں گے ۔

بڈائے۔ آؤ جوان ادھر آؤ۔ تمہیں بندوق دیں۔ توپ دکھائیں۔

مریض۔ (خوفناک ہنسی کے ساتھ) مار ڈالو۔ جو ملے مار ڈالو۔ کوئی بچے (قہقہے فاصلے پر جا کر غائب ہو جاتے ہیں)

دوسرا مریض۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) توپ۔ بندوق (روتا ہے) توپ۔ بندوق (ہنستا ہے) توپ بندوق (قہقہہ)

نرس۔ لو جلدی سے یہ دوا پی لو۔ بہادر نازی۔ اسے پی جاؤ۔

دوسرا مریض۔ (قہقہہ بلند کر کے) توپ پلاؤ۔ بندوق۔ بندوق۔ بن اور دوق (قہقہہ)

نرس۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ بہادر ہو۔ سپاہی ہو۔ لو اسے پی لو۔

دوسرا مریض۔ (آگ لگا دو (قہقہہ بلند کر کے) اجاڑ دو۔ ویران کر دو مار دو۔ لوٹو (قہقہہ)

نرس۔ اوہ۔ بہت عمدہ اثر۔ بالکل تندرست ہو گیا۔ اسے پی لو (کچھ پینے کی آواز) ٹھیک ہے۔

(موٹر رکنے کی آواز)

بڈائے (آتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب آ گئے شاید

نرس۔ (شیشی رکھتے ہوئے) ہاں ڈاکٹر آ گئے۔

(قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر۔ نرس کیا حال ہے۔ مریضوں کا۔؟

نرس۔ بالکل ٹھیک ہو گئے بڑا اچھا اثر کیا ہے ٹیکہ نے جنرل وان ڈف

کا کیا ہوا؟

ڈاکٹر۔ ایک دم دماغ سیدھا ہو گیا تھا۔ تقریر کرتے کرتے اس نے نازی پالیسی کی دھجیاں اڑانا شروع کر دیں اور آخر میں تو ایسا بہکا کہ صلح کی اپیل کرنے لگا۔ میں نے جاتے ہی اس کو ریشتاغ سے نکالا۔

نرس۔ ریشتاغ کو تو ڈس انفکٹ disinfect کرانا چاہیے تھا

ڈاکٹر۔ اوہ۔ فوراً میں نے حکم دیا ہے کہ تمام بلڈنگ ڈس انفکٹ کی جائے اور تمام ممبروں کو وار اسپرٹ مکسچر کا ایک ایک ڈوز پینے کی ہدایت کی

نرس۔ تو اب جنرل وان ڈف ٹھیک ہیں نا بالکل؟

ڈاکٹر۔ ٹھیک کیسے نہ ہوتے ٹیکہ تو ان کے لگ ہی چکا تھا میں نے جاتے ہی ان کو سو فی صدی کا اینٹی پیس Anti peace انجکشن دیا پہلے تو بہت اچھلے کودے اس کے بعد کھڑے ہو گئے تقریر کرنے اور جو کچھ صلح کی تائید میں کہہ چکے تھے خود ہی اس کی تردید کر دی۔

نرس۔ سب بہت خوش ہوئے ہوں گے۔

ڈاکٹر۔ گورنگ نے مجھکو گود میں اٹھا لیا اور باقی تمام ممبروں نے مبارکباد دی۔ میں ان مریضوں کے خیال سے زیادہ ٹھہرا ہی نہیں۔ تو یہ مریض کیسے ہیں؟

نرس۔ ابھی ہوش میں آئے ہیں میں نے مکسچر پلا دیا ہے اور اب وہ بالکل نازیوں جیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ بلاؤں میں ان کو؟"

ڈاکٹر۔ ساتھ نہیں۔ ایک ایک کر کے!!

برقی بیگم

(نرس جاتی ہے)

بوائے۔ حضور اتنی جلدی وہ پلٹے ہیں صحت کی طرف کہ تعجب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر۔ ان کو اس دوا سے ٹھیک ہونا ہی چاہئے تھا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر یہ دوائیں بے اثر ہوتیں تو آج میدان میں نازی جھنڈے کے نیچے سرفروشی کرنے والا ایک بھی نہ ملتا۔

بوائے۔ دوائیں کیا ہیں جادو کا اثر رکھتی ہیں۔ بڑے بڑے پرانے اور پیدائشی صلح پسند راست باز۔ ایماندار سچے ایک ہی ٹیکے اور ایک ہی خوراک میں ایسے تندرست ہوے کہ جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہ تھے۔

(نرس آتی ہے اور اس کے ساتھ وحشیانہ طریقہ پر ہنستا ہوا مریض آتا ہے۔)

ڈاکٹر۔ کہو دوست کیا حال ہے۔ لڑائی پر جاؤ گے۔

مریض۔ ضرور جائیں گے۔ ماریں گے۔ لوٹیں گے (قہقہہ) توپ بندوق مشین گن (قہقہہ)

ڈاکٹر۔ مگر دیکھو تو یہ بات صلح کے خلاف ہے صلح کتنی اچھی چیز ہے۔

مریض۔ صلح۔ ہش۔ صلح فالج کو کہتے ہیں۔ صلح بزدلی ہے۔ ہنگامہ آفت قیامت (قہقہہ) توپ بندوق (مسلسل قہقہہ)

ڈاکٹر۔ شاباش بہادر مگر سنو تو سہی یہ لڑائی انسانیت کے خلاف ہے۔

مریض۔ انسانیت؟ (ہنستا ہے) انسانیت ڈھونگ ہے نازی کو

آدمی بنا دینے والی کمزور چیز۔ لڑائی کی دشمن۔ ہم لڑیں گے۔ قیامت مچا دینگے۔

ڈاکٹر۔ یہ تو ٹھیک ہے بہادر سپاہی مگر ایمانداری؟

مریض (بہت زور سے ہنس کر) ایمانداری؟ ایمانداری کو توپ سے اڑا دیں گے۔ ہم نازی ہیں۔ ایمانداری سے لڑینگے۔ ایمانداری کا پیچھا کرینگے (قہقہہ)

ڈاکٹر:۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اچھا دیکھو نرس اسکے کان بہرے کردو تاکہ یہ جنگ کے ہنگاموں کی آواز کے علاوہ اپنی ہی کہے کسی اور کی نہ سُنے یاد رکھو سب سے پہلا نازی اصول یہی ہے کہ بازو ہاتھ کی زبان ہو اور کان ندارد۔

نرس۔ میں اسے بہرا کئے دیتی ہوں، عقل کے دروازے بند ہی ہو چکے ہیں اور اب یہ پورا نازی بن گیا ہے۔

ڈاکٹر۔ ہاں اسے بہرہ کرکے چھاؤنی بھیج دو اور دوسرے مریض کو لاؤ۔

بوائے۔ لائیے مس صاحبہ میں اس کو بہرہ کرنے کے کمرے میں پہونچا دوں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی)

ڈاکٹر۔ (رسیور اٹھا کر) ہاؤس سرجن برلن ہاسپٹل۔ اچھا اچھا ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ بہت اچھا کیا (نرس آتی ہے) وہ بہت اچھا انتظام ہے۔ بیشک ہم سب نے غلط سمجھا تھا۔ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک بائی بائی۔

نرس۔ کون تھا۔

ڈاکٹر۔ سپرنٹنڈنٹ پاگل خانہ۔ اس نے کہا کہ ہم لوگوں نے مدتوں سے یہ غلطی کی تھی کہ بہت سے پاگل جیلخانے میں بھر رکھے ہیں اور کارآمد نازیوں کو خواہ مخواہ پاگل خانہ میں بھر رکھا ہے مگر اب ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ان سب کو فوج میں ہونا چاہئے اور جیل والے قیدیوں کو اصل میں پاگل خانے میں جانا چاہئے۔

نرس۔ ڈاکٹر آخر اس بات پر آج تک کسی نے غور کیوں نہیں کیا تھا وہ تو سچ مچ بنے بنائے سپاہی ہیں۔

ڈاکٹر۔ اور جیل والے بنے بنائے پاگل!!

نرس۔ بالکل۔ اچھا تو اب اس غلطی کو ٹھیک کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر۔ ہاں۔ سارا پاگل خانہ خالی کر کے فرانٹ پر بھیجدیا گیا ہے اور جیل کو پاگل خانہ بنادیا گیا ہے۔

نرس۔ ٹھیک ہے اچھا اب اس مریض کو دیکھو یہ چپ بہت رہتا ہے۔

ڈاکٹر۔ یہ تو وہی ہے نا جس کو آج ہی اس پہلے مریض کے ساتھ انجکشن دیا گیا ہے۔

نرس۔ ہاں ہاں وہی تو ہے۔

ڈاکٹر۔ کیوں تم کیسے ہو کیا حال ہے تمہارا؟

مریض ۲۔ میں خالی بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔ کس کا منھ نوچوں کس سے لڑوں (وحشیانہ طریقہ پر) کس کو گولی کا نشانہ بناؤں کس کو

پھاڑ کھاؤں۔

ڈاکٹر۔ بری بات۔ بہت بری بات۔ یہ سب انسانیت کے خلاف باتیں ہیں۔

مریض ۲۔ انسانیت؟ انسانیت کیسی؟ (قہقہہ لگاکر) انسانیت کیا ہوتی ہے۔ ہم نازی ہیں۔ ارے ہم نازی ہیں۔ انسانیت کو ہم کیا کرینگے۔

ڈاکٹر۔ تم لڑنا چاہتے ہو مگر یہ تو بہت بری بات ہے کہ حق کے خلاف لڑو۔

مریض ۲۔ حق۔ ہمارا حق صرف لڑنا ہے۔ اُدھم مچانا ہمارا حق ہے۔ ہم صرف شرپسند ہیں۔ ہنگامہ ہمارا حق ہے۔ جنگ ہمارا حق ہے اور باقی حق کچھ نہیں۔

نرس۔ دیکھ رہے ہو ڈاکٹر کتنا حیرت انگیز طریقہ پر اثر ہوا ہے۔

ڈاکٹر۔ اس کو بھی بہرا کرکے چھاؤنی روانہ کردو۔

مریض ۲۔ ہو (قہقہہ بلند کرتے ہوئے) چھاونی؟ چھاؤنی نہیں توپ۔ توپ کا گولہ۔ بم کا گولہ۔ (مسلسل قہقہے)

(آوازیں بتدریج غائب ہو جاتی ہیں)

میں جاتا ہوں

(معنون کرتا ہوں میں اپنے اس مضمون کو ان سورماؤں کے نام سے جو ہٹلر سے نہیں بلکہ اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں اور لڑائی پر نہ جانے کا صرف یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ وہ کسی طرح نہیں مانتیں، حالانکہ ان کو منانے کی ترکیب کچھ اور ہی ہے)

گھر میں ایک کہرام تھا، بچے اجاڑ پھر رہے تھے ملازم سہمے ہوئے سے نظر آرہے تھے۔ چولھا ٹھنڈا پڑا تھا، بلی بھوک کے مارے سب کے پیروں میں لپٹتی پھرتی تھی اور ہر ایک اس کو جھڑک دیتا تھا۔ بیگم لحاف کے اندر گھسی ہوئی رو رہی تھیں اور ہم آرام کرسی پر لیٹے ہوئے سیٹی بجا رہے تھے کہ یکایک ڈیوڑھی سے آواز آئی: "سواری اتروالو" بیگم نے لحاف کے اندر سے اپنا تمتمایا ہوا چہرہ نکالا۔ نوکر ڈیوڑھی کی طرف دوڑ پڑے، بچے کچھ ٹھٹک سے گئے۔ بلی نے کہا "میاؤں" اور ہم نے اپنے دل میں کہا الٰہی خیر۔

دیکھتے کیا ہیں کہ خوش دامن صاحبہ پائنچے سنبھالتی گھر بھر کو گھورتی مسولینی کی طرح پھنکاریں مارتی تشریف لا رہی ہیں۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ

ماجرا کیا ہے۔ کرسی سے اٹھ کر فرشی سلام کیا اور خشمگیں آنکھوں سے خشک تبسم کا جواب پایا گویا کہا تو گیا "جیتے رہو" مگر معنی اس کے یہ ہوئے کہ "خدا غارت کرے تم کو" خوش دامن صاحبہ ایک جنگی ٹینک کی طرح صحن کے نشیب و فراز طے کرتی ہوئی اپنی صاحبزادی کے بستر کے پاس پہونچیں اور سرہانے بیٹھ کر پہلے تو اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو درست فرمایا اس کے بعد ہم کو آواز دیکر اس طرح طلب کیا گیا کہ گویا کوئی فوجی مجرم کورٹ مارشل کے لئے بلایا گیا ہو مگر ہم ٹھہرے ہونے والے سپاہی جس کو کچھ ہی دنوں کے بعد میدان میں جاکر اس سے کہیں زیادہ خوفناک مناظر سے دوچار ہونا تھا لہذا فوجی جرات کے ساتھ آرام کرسی سے اٹھے اور خوش دامن صاحبہ سے جاکر عرض کیا "فرمائیے"

خوش دامن صاحبہ نے گوئرنگ کی طرح نتھنے پھلا کر کہا "یہ آخر تم نے کیا آفت مچا رکھی ہے؟ اگر بھیا تم کو اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے تو کم سے کم ان معصوم بچوں کی طرف دیکھو آخر بیوی بچوں کا بھی کوئی حق ہے۔

وہ پوچھ بیٹھیں بیوی بچوں کے حق کے متعلق اور ہم سوچ رہے تھے ساس کے حقوق کے متعلق، بہرحال ہم نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا "مجھے اپنی جان بھی عزیز ہے اور بیوی بچوں کی حق تلفی کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے"

خوش دامن صاحبہ نے ٹیپ کا بند ارشاد فرمایا "پھر یہ آخر لڑائی

پر جانے کی کیا سوجھی ہے"

ہم نے ایک بہادر سپاہی کی طرح اس خطرناک سوال کا جواب دیا "اس لئے جانے کا ارادہ ہے کہ موت صرف ایک مرتبہ آتی ہے اور صرف میدان جنگ ہی میں نہیں بلکہ گھر کا پتہ بھی اس کو معلوم ہے اور اگر اس کو آنا ہے تو وہ یہاں تک آسکتی ہے"

خوش دامن صاحبہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آج تک کبھی لاجواب نہیں ہوئیں چنانچہ اس موقعہ پر بھی بولیں "یہ تو ٹھیک ہے کہ موت برحق ہے اور جو پیدا ہوا ہے اس کو ایک دن مرنا ضرور ہے مگر یہ تو جان بوجھ کر موت کے منھ میں جانا ہوا"

ہم نے کہا "یہ آپ کیونکر کہہ سکتی ہیں، آخر آپ لوگ اس بات کو اس رُخ سے کیوں دیکھتے ہیں یہ کیوں نہیں کہتے کہ لڑائی پر جانے کے معنی یہ ہیں کہ موت کو گویا اپنے سے دور بھگا یا جائے اور زندگی کو موت کے بھیانک درندوں کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔

خوش دامن صاحبہ کی تعلیم ذرا اچھی سی ہے۔ لہذا وہ فوراً بولیں "کیا مطلب ہے"؟

ہم نے مطلب سمجھاتے ہوئے یہ سمجھ کر کہ یہ کچھ بھی نہ سمجھی ہوں گی اور براہِ راست اپنی بیٹی کی ماں ثابت ہوں گی۔ بہرحال کہنا شروع کیا۔

"یہ لڑائی دراصل موت اور زندگی کی لڑائی ہے ہیں جس طرف سے لڑنے جا رہا ہوں وہ طاقت زندگی حاصل کرنے اور زندہ رہنے کے حق

کے لیے اس طاقت سے لڑ رہی ہے جو سوائے اپنے کسی اور کو زندہ دیکھنا ہی نہیں چاہتی، اگر جیت ہماری ہوئی تو ہم سب کی زندگی محفوظ اور بے خطر ہوگی ورنہ ہماری زندگی پر موت کی حکومت ہوگی۔"

خوش دامن صاحبہ نے اپنا دہکتا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر اپنی والدہ صاحبہ کی سرحد سے ہم پر حملہ کرتے ہوئے کہا "بیوی بچوں کا خیال تو اسے ہوتا ہے جو بیوی بچوں کو کسی شمار قطار میں بھی سمجھے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اسی بیوی بچوں کے جنجال سے اپنی جان چھڑانے کی یہ ترکیب نکالی ہے مگر میں بھی کہے دیتی ہوں کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر میں تو ہرگز جانے نہ دوں گی۔"

ہم نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے کو ہٹلر اور مسولینی سے بھی بڑا خطرہ سمجھتی ہیں کہ گویا میں آپ سے بچنے کے لیے ان دونوں کے مقابلہ کو آسان سمجھتا ہوں مگر ہاں اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ ان دونوں پر فتح پا لینا آسان ہے مگر آپ۔ بیگم نے بات کاٹ کر کہا "آخر صاف صاف کیوں نہیں کہتے ہو کہ یہ سب کچھ کیوں کیا ہے اور یہ ارادہ کس وجہ سے ہوا ہے۔

خوش دامن صاحبہ نے پھر اپنا رخ بشکل تمام یعنی بڑے اہتمام کے ساتھ ہماری طرف کرتے ہوئے فرمایا وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ آخر بات کیا ہے؟"

ہم نے کہا "ان کو تو ہے وہم۔ نہ میں نے کسی خاص سبب کی وجہ سے یہ ارادہ کیا ہے نہ اس ارادہ کی کوئی اور وجہ سوائے اس کے ہو سکتی ہے کہ یہ ایک فرض ہے۔"

بیگم نے کہا "خیر بس اب رہنے بھی دو۔ نہ پہلے کبھی اس فرض کا خیال آیا

نہ پوچھو اس دن جب میں نے وہ موئے پتے کھیلنے کو منع کیا ہے اور ذراسی بات کہکر ایک قیامت تم سے اٹھوائی ہے بس جب ہی سے یہ رٹ لگی ہوئی ہے۔

خوش دامن صاحبہ نے پان کا تبادلہ ایک گال سے دوسرے گال کے ضلع میں کرتے ہوئے فرمایا "پتے کیسے۔ کیا اب یہ شوق بھی ہوا ہے"

بیگم نے گویا آخری ترپ چلتے ہوئے کہا "ایسا ویسا شوق، دن رات موے پتے ہونے لگے ہیں۔ آدھی آدھی رات تک دوستوں کا مجمع ہے اور بازی پر بازی ہو رہی ہے۔ میں نے آخر اس دن اتنی بات ضرور کہی کہ یہ موا منحوس کھیل ہے جس گھر میں ایسے کھیل ہوں وہاں کبھی برکت نہیں ہوسکتی، پھر یہ کہ ایک تو اتنی سی تنخواہ میں یوں ہی خرچ چلنا دشوار ہے۔ دوسرے جب روپیہ لگاکر تاش ہوں گے تو گھر کا خدا ہی حافظ ہے بس یہ کہنا تھا کہ جیسے کسی نے بارود میں آگ لگادی، بھڑکے چھتے کو چھیڑ دیا، سارا گھر انہوں نے سر پہ اٹھالیا یہ چیز توڑ وہ پھوڑ، کیتلی موئی ٹوٹی۔ آئینہ چور چور ہوگیا۔ اور

ہم نے عاجز آکر کہا:" ارے صاحب اسی وجہ سے تو منھ کالا کر رہا ہوں کہ آپ کو میرے غصے، میرے جوئے اور میرے منحوس اشتعال سے نجات مل جائے گی، اب آخر یہ دکھڑا کیوں رویا جارہا ہے"!

خوش دامن صاحبہ نے اگالدان سے مشورہ کرنے کے بعد کہا "بھیا اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں تمہارا گھر ہے اور تمہاری کمائی چاہے اسے رکھو یا اڑاؤ تمہیں اختیار ہے مگر ہاں اتنا میں بھی کہوں گی کہ اس موئے شوق کے پیچھے لاکھ کے گھر خاک ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔

اللہ بخشے تمہارے خسر کو گھوڑ دوڑ کا شوق تھا۔ ہزاروں روپیہ اس موئے شوق کے پیچھے پھونک دیا، مگر جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو ایسی توبہ کی کہ پھر کبھی گھوڑ دوڑ کا نام تک نہیں لیا"

ہم نے کہا" ارے صاحب، کبھی کبھی کا دل بہلاوا ہے۔ آجکل کون ایسا ہے جو برج نہ کھیلتا ہو، مہذب لوگوں کا خاص مشغلہ یہی ہے میں تو خیر گھر ہی میں بیٹھ کر کھیل لیا کرتا ہوں ورنہ اور لوگ تو کلب میں جاکر کھیلتے ہیں اور ان کو کوئی بھی نہ جواری کہتا ہے نہ کوئی اس طرح ٹوکتا ہے، گھر سے رات بھر غائب رہتا یا دوسرے لوگوں کی طرح اس شوق کے بجائے کوئی اور شوق شروع کردیتا تو پتہ چلتا ان بیگم صاحبہ کو کہ شوق کسے کہتے ہیں مگر نہ مجھے دنیا کا کوئی شوق نہ میں کسی بڑی بات میں ہوں لے دے کر تاش کبھی کبھی کھیل لیتا ہوں تو تمام دنیا میں اسی کا رونا رویا جاتا ہے۔ بہرحال اب یہ سب قصے ہی پاک ہوئے جاتے ہیں"۔

خوش دامن صاحبہ نے اپنے تمام اختیارات سے کام لیکر کہا" ہوش میں آ لڑکے۔ قصہ پاک ہوا جاتا ہے۔ جاؤ تو سہی لڑائی پر پھر دیکھو یہ نہ سمجھ لینا گھر سے نکلنا ایسا آسان کام ہے۔

ہم نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا" اب تو بہرحال طے ہی ہو چکا ہے آج ۸ر تاریخ ہے۔ ۲۰ر کو بمبئی سے جہاز روانہ ہوگا اسی پر روانگی کا حکم مل چکا ہے"۔

بیگم نے کہا "سب کچھ طے ہو چکا ہے مارے غصے کے فوراً اپنے
کو بھرتی کرا دیا" اس کے بعد ہی روانگی کا حکم بھی جا کر لے آئے۔

خوش دامن صاحبہ نے ماتھے پر "ہائے کمبختی" والا ہاتھ رکھ کر فرمایا
"واہ واہ جس کا ایسا کچا ساتھ ہو کہ چھوٹے چھوٹے بچے جن کو ابھی ذرا
بھی سمجھ نہیں، گھر میں کوئی دوسرا نہیں جو گھر سنبھال سکے نہ کوئی موئی ایسی
جائداد رکھی ہے کہ سب کا پورا پڑ جائے وہ ناسمجھی میں ایسی حرکت کر
بیٹھے اور آخر ننھی یہ تمہاری بھی تو زیادتی تھی کہ مرد کو بات بات پر تم نے
ٹوکا۔ اے تاش کھیلتے تھے تو تمہاری بلا سے، مرد نہ معلوم کیا کیا کرتے
پھرتے ہیں، تمہارے باوا کو تو اگر میں آدھی بات بھی گھوڑ دوڑ کے
لئے کہہ دیتی تو قیامت برپا کر دیتے ایسی باتیں عورتوں کے سمجھانے
سے تھوڑی سمجھ میں آیا کرتی ہیں جب سمجھیں گے خود ہی سمجھیں گے۔

ہم نے حالات امید افزا دیکھ کر کہا کہ میں خود کب یہ کہتا ہوں کہ تاش
کھیلنا اچھی چیز ہے مگر دل بہلانے اور دن بھر کی دفتر کی چکی کے بعد
دماغ تازہ کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ آخر ہونا ہی چاہیئے اگر کبھی
ایک آدھ روپیہ لگا کر تاش کھیل لئے تو کونسا ہرج ہو گیا ہزار دن
کمانے والا اگر دس پانچ اڑا بھی دے تو آخر اس میں اسقدر برہمی کی
کون سی بات ہے کہ کھانا پینا چھوڑ دیا منہ پھلائے لیٹی ہوئی ہیں، بات
کا جواب ندارد۔ سبحان اللہ گویا ہم آدمی تو ہیں نہیں جانور ہیں یا شاید
یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ان کے زرخرید ہیں عجیب طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔"

خوش دامن صاحبہ نے موقعہ کی نزاکت اور بیٹی کے سہاگ کو مدنظر رکھ کر فرمایا۔" نہیں تم ٹھیک کہتے ہو یہ ان کی غلطی ہے مگر بیٹا تم اس حکم کو کسی طرح ٹالو۔ ان کی ناسمجھی کی وجہ سے اتنی بڑی ناسمجھی تم کیوں کر رہے ہو؟"

ہم نے کہا" ناسمجھی تو خیر میں نہیں کر رہا ہوں خدا اس موقعہ پر سب کو لڑائی پر جانے کی توفیق دے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا یہ حکم ٹل جائے "

اس معرکہ کے بعد سے گھر میں امن ہے، بھرتی تو خیر پہلے بھی نہ ہوئی تھی اور نہ ہمارے ایسے کمزور دل لڑائی کا تصور کر سکتے ہیں مگر وہ جو مثل ہے نا" بوڑھا ڈراے مرنے سے جوان ڈرائے نکلنے سے" چنانچہ آموں کے پارسل کی بٹی کو لڑائی پر جانے کا حکم کہکر سب کو دھمکا دیا اور اب نہ لڑائی ہے نہ کچھ ابا ہر مردانہ میں بٹھا ٹھ سے تاش ہوتے ہیں اور اندر سے بیگم ہنسی خوشی اپنے جواری شوہر اور اس کے قمار باز دوستوں کو پان بنا بنا کر بھیجتی رہتی ہیں۔ بغیر لڑائی پر گئے ہوئے ہماری تو گویا ہی فتح ہے "

بوہنی میں اسپیٹ

آپ کا ایسا ہی برا بھلا کہنے کو جی چاہتا ہے تو آپ زیادہ سے زیادہ مجھ کو شاعر کہہ سکتے ہیں مگر مشاعرہ میں ہرگز نہیں ہوں۔ اور اگر آپ انصاف سے کام لیں تو یہ واقعی زیادتی ہے کہ ایک فرد واحد کو پورا مشاعرہ سمجھ لیا جائے مگر مجھ بدنصیب پر یہ زیادتی ہو چکی ہے جس کی داستان ذرا تفصیل طلب ہے۔

جھوٹ کیوں کہوں شاعر تو خیر میں ہوں بھی شاعر ہونا اسی کو کہتے ہیں نا کہ انسان کا ایک تخلص ہو وہ شعر کہتا ہو کہہ کر پڑھتا ہو اور اگر زیادہ شامت آجائے تو چھپوا تا بھی ہو۔ مجھکو اپنی تمام کمزوریوں کا اعتراف ہے۔ تخلص بھی ہے نظمیں اور غزلیں بھی کہتا ہوں مشاعروں میں شرکت بھی کرتا ہوں اور اپنا کلام رسالوں اور اخباروں میں چھپوا تا بھی ہوں مگر اس کے باوجود مجھ کو زیادہ سے زیادہ آپ شاعر ہی تو کہہ سکتے ہیں میں مشاعرہ کیونکر ہو سکتا ہوں مگر قسمت میں یہ بھی لکھا تھا، میں صرف شاعر نہیں بلکہ مشاعرہ بن کر رہوں چنانچہ قسمت کے لکھے کو میں نہ مٹا سکا۔

جرم صرف یہ ہوا کہ اپنے چند معاصرین کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک

مشاعرے کے دعوت نامے کے جواب میں لکھ دیا کہ مجھکو شرکت میں کوئی عذر نہیں مگر میں مشاعرہ کمیٹی سے اتنی رقم وصول کر دوں گا۔ ظاہر ہے کہ یا تو آدمی اس قسم کی ادبی محافل میں شرکت کی کوئی فیس ہی نہ لے اور اگر لینا ہی ہے تو پھر اپنے شایان شان لے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ عام آدمی عموماً اور شاعر خصوصاً اپنی قیمت کا کچھ زیادہ ہی تخمینہ لگاتے ہیں چنانچہ یہی ہوا کہ مشاعرہ کمیٹی نے میرے مطالبہ کو بظاہر اپنی حیثیت اور دراصل میری اوقات سے زیادہ سمجھ کر مجھ کو لکھا کہ یہ بہت زیادہ ہے اس میں تخفیف فرمائی جائے۔ اس قسم کے موقعوں پر خود دار آدمی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اگر مول تول کرے تو شاعری اور ترکاری میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور اگر راضی برضا ہو جائے تو معاوضہ وہ ملتا ہے جس کی رسید دینے سے تو مر جانا ہی بہتر ہے اور اس صورت میں اب اپنے مطالبے سے نیچے اترنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا خواہ مشاعرے کی شرکت سے محروم ہی کیوں نہ رہنا پڑتا۔ لہذا جواب میں ذرا سختی سے لکھ دیا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ شاعر سے دام چکا رہے ہیں اس "فرش نشین" مگر عرش نشیمن" کو نیلام پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ اگر مطلوبہ رقم پیش کرنے سے آپ قاصر ہیں تو یہ خاکسار بھی شرکت مشاعرہ سے معذور رہے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ تو مشاعرے کو ذریعۂ معاش بنانے کا ارادہ کیا اور اس میں بھی مول تول شروع ہو گیا۔ سبحان اللہ! اسکو کہتے ہیں "بوہنی ہی میں لیٹ ہ

خیر۔ وہ کچھ بھی ہو مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ نیلامی بولیاں کوئی اپنے اوپر شروع کرا دے۔ شرکت مشاعرہ سے انکار کر کے مشاعرے کی طرف سے ایک آدھ دن میں صبر آ ہی گیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ صبر آخر آ ہی جاتا ہے اور یہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ مگر اس سے زیادہ سچی بات کسی نے یہ کہی ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، یعنی قطعی غیر متوقع طور پر اس مشاعرے کے سکریٹری صاحب کا پھر ایک گرامی نامہ موصول ہوا کہ "مشاعرہ کمیٹی نے آپ کے والا نامہ پر غور کرنے کے لئے ایک خصوصی اجلاس طلب کیا اور گرما گرم مباحثہ کے بعد آخر کار طے یہ ہوا کہ آپ کا مطالبہ منظور کر لیا جائے۔ چنانچہ گذارش یہ ہے کہ اب آپ مقررہ تاریخ پر یہاں پہنچنے کے لئے صبح کی ٹرین سے روانہ ہو جائیں تاکہ شام کو یہاں پہنچ سکیں اور آپ کا استقبال آپ کے شایان شان ہو سکے۔"

کیوں صاحب ان حالات میں اگر یہ خط آپ کے پاس آتا تو کیا آپ کو اپنی اہمیت کا احساس نہ ہوتا اور کیا آپ غور نہ کرتے کہ صرف آپ کے ایک خط پر غور کرنے کے لئے ایک عظیم الشان مشاعرے کی مشاعرہ کمیٹی کا اجلاس خصوصی طلب کیا گیا اور اس میں گرما گرم مباحثہ ہوا اور فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوا۔ پھر یہ کہ آپ کے شایان شان استقبال تک کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آپ یقیناً اس خط کو بار بار پڑھتے جیسا کہ میں نے پڑھا اور ایک ایک لفظ کے معنی نکالتے جس طرح میں نے نکالے اور آخر اس استقبال کے شایان شان اپنے کو بنانے کی تیاریاں

شروع کردیں۔ کہ سیاہ شیروانی تو ہونا ہی چاہیے اس لئے کہ ایک تو یہ شام کا لباس ہے۔ دوسرے سیاہ شیروانی پر سفید ہار کے سفید پھول خوب کھلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ٹرین سے اترتے ہی مشاعرہ کمیٹی کے لوگ استقبال کی ابتدا ہار پہنا کر کرینگے اور فوٹوگرافر مختلف زاویوں سے تصویریں بھی لیں گے۔ ان تصاویر میں سیاہ شیروانی اور اس پر ہاروں کے سفید پھول پھوٹ نکلیں گے پھر شیروانی تو تصویر کو سجا دیتی ہے بشرطیکہ چوڑی دار پاجامہ کسی موچی نے نہیں بلکہ کسی باقاعدہ درزی نے سیا ہو۔ شیروانی بغیر چوڑی دار پاجامہ کے سہاگن نہیں معلوم ہوتی اور چوڑی دار پاجامہ بغیر پھول دار موزوں اور وارنش کے پمپ کے کچھ بندوق کا غلاف بن کر رہ جاتا ہے۔ لطف آجائے اگر اس لباس پر ایک اعلیٰ درجہ کی جناح کیپ بھی ہو۔ اس تمام سامان کا تخمینہ ذرا حوصلہ شکن ضرور تھا مگر مشاعرہ کمیٹی سے جو رقم طے ہوئی تھی اس میں یہ چیزیں بھی شامل تھیں چنانچہ یہ تمام سامان خریدنے میں پوری ریاست سے کام لیا گیا اور درزی کو ہدایت کردی کہ اجرت کا کوئی سوال نہیں البتہ شیروانی ایسی ہو کہ مشاعرہ لوٹ لائے اور چوڑی دار پاجامہ بھی ایسا ہو کہ حاصل مشاعرہ سمجھا جائے۔ کرتا آپ کی دعا سے موجود تھا جو اسی قسم کی تقریبات کے لئے تبرک کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ اس کرتے پر جو بیل کڑھی ہوئی ہے اس کے پھولوں کو اکثر لوگ دھوکہ کھا کر سونگھ لیا کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں اسی کرتے کی سب سے زیادہ فکر تھی اور شکر ہے کہ یہ کرتہ مع

اپنے گریبان کے اگست ۱۹۴۷ء کے دستِ وحشت سے صاف بچ گیا اس کرتے کے نیچے جالی دار بنیائن کچھ ایسا منظر پیش کرتی ہے گویا جمنا کے اندر تاج محل کا عکس پڑ رہا ہو۔ مگر معاف کیجئے گا یہ ایک غیر ملکی قسم کا استعارہ ہے۔ استعارہ بھی نہیں بلکہ غیر ملکی تشبیہہ ہے تو اب اس کو یوں سمجھئے کہ اس کرتے کے نیچے جالی دار بنیائن ایسی معلوم ہوتی ہے گویا سمندر میں کلفٹن جھانک رہا ہو۔ مگر ان چیزوں کے علاوہ سفر کے لئے اور ایسے سفر کے لئے جس کا اختتام عظیم الشان استقبال پر ہونے والا ہو، بیشمار چیزوں کی ضرورت تھی مثلاً ایک اعلیٰ درجہ کا سوٹ کیس ہونا چاہیئے تھا۔ خیر وہ تو بیگم صاحبہ نے کہا کہ میں اپنے بھائی جان سے منگا دوں گی بستر کے لئے ہولڈال تو خیر موجود تھا مگر اس کے تسمے گھوڑے تانگے کا کھیل کھیلتے ہوئے بچے اپنے صرف میں لا چکے تھے لہذا وہ بھی خریدے گئے۔ اب رہ گیا بستر کا سامان۔ اس سلسلہ میں آپ کو یہ سن کر مسرت ہو گی کہ آپ کا یہ غلام بے حد خوش قسمت واقع ہوا ہے۔ بستر کی سب سے بڑی چیز ہے۔ لحاف۔ وہ بیگم صاحبہ کے جہیز میں آیا تھا اور اگر انکسار سے کام نہ لیا جائے تو در اصل اس قابل ہے کہ فریم کرا کے گول کمرے میں لگا دیا جائے۔ یہ لحاف عام طور پر ایک بڑے سے صندوق میں بند رہتا ہے اور اس کو استعمال کرنے کے لئے اس خاکسار کو انتظار ہے۔ کسی ایسے وقت کا جب اس کارساز کی قدرتِ کاملہ کسی ملک کی فرمانروائی عطا کرے گی تو شاہی چھپر کھٹ پر یہ لحاف زیب دے گا۔ مگر اس مشاعرے کے لئے

بیگم نے اس لحاف کو استعمال کرنے کی اجازت دیدی۔ پھر گھر بھر کے تکیے جمع کیے گئے اور ان کا طبی معائنہ شروع ہوا کہ ان میں سے وہ کونسے دو تکیے ہیں جو کم سے کم مرمت کے بعد بادی النظر میں تکیے سمجھے جا سکیں معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں بلوہ ہو گیا ہے اور یہ تکیے نہیں بلکہ اس بلوے کے زخمی یہاں لا کر تلے اوپر ڈھیر کر دیئے گئے ہیں۔ بمشکل تمام دو تکیے نظر انتخاب کا مرکز بنے اور یہ طے پایا کہ تکیہ بذات خود کوئی چیز نہیں تکیے کو تو اس کا غلاف سجاتا ہے اور غلاف خدا کے فضل سے ایسے ایسے ہمارے یہاں موجود ہیں کہ لوگوں کو چاہیے کہ دور دور سے دیکھنے کو آئیں اور سیاحوں کی نظر پڑے تو تصویریں اتار لے جائیں چنانچہ ان دو تکیوں کے لئے جو دو غلاف نکالے گئے ان میں سے ایک پر اودے نیلے۔ پیلے ریشم سے کڑھا ہوا تھا WELCOME اور دوسرے پر ایک ایسی چڑیا کی دیدہ زیب تصویر تھی جس کو دیکھ کر علم حیوانات کے ماہر حیران ہیں کہ یہ آخر کس نسل کی چڑیا ہے اور دنیا کے کس حصے میں پائی جاتی ہے۔ بستر کی چادر البتہ کوئی ایسی نہ تھی جو ایسے تکیوں اور ایسے لحاف کے ساتھ سج سکے۔ متعدد بکس ٹٹولنے کے بعد ایک خوبصورت چادر مل تو گئی مگر اس میں یہ نقص نکل آیا کہ اس کے کناروں پر چاروں طرف عجیب عجیب مصرعے چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً یہ

"روزی خود میخورد بر خوان تو"

ظاہر ہے کہ ایسی چادر ساتھ لیجانے سے تو یہی اچھا تھا کہ بغیر بستر کے

ہو پہنچ جاتے۔ مگر واہ ری منتظم بیوی۔ دروازے کا ایک پردہ اتار کر اس کے کپڑے نکال دیئے اور اب جناب وہ ایسی لاجواب چادر بنی ہے کہ بس دیکھا کیجئے۔ خدا خدا کر کے بستر اور سوٹ کیس کا سامان مکمل ہو گیا اور اب اس سفر کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت تھی ایک ذرا خوبصورت سا لوٹا دوسرے ذرا مناسب سی سلیپر۔ لوٹوں کے سلسلہ کی مجبوری یہ تھی کہ جو لوٹے صورت شکل کے اعتبار سے درست تھے وہ ٹپکتے تھے اور ایک لوٹا جو ٹپکتا نہ تھا اسکی ڈنڈی خدا جانے کس حادثہ میں ٹوٹ گئی تھی اور بیگم صاحبہ اس بات کی سخت مخالف تھیں کہ اتنے بڑے شاعر کے لئے ایک لوٹا تک کسی سے مانگا جائے کافی غور و فکر کے بعد طے پایا کہ لوٹا دراصل عہد جہالت کی یادگار ہے اور اس روشنی اور ترقی کے دور میں بغیر لوٹے کے بھی زندگی بسر ہو سکتی ہے بلکہ وہ زندگی جو لوٹے کے ساتھ بسر ہو نہ ترقی یافتہ زندگی کہلاتی ہے نہ ترقی پسند زندگی۔ چنانچہ لوٹا تو لایا گیا تخفیف میں اور سلیپر کی جگہ بیگم صاحبہ نے مشورہ دیا کہ وہ پھولدار کھڑاویں رکھ لیں جن میں سے ایک کی کھونٹی رات سے غائب تھی۔ مگر حال ہی میں پتہ چلا کہ شطرنج کے مہروں میں رکھی ہوئی ہے اور بادشاہ کے بجائے اس لئے استعمال ہوتی ہے کہ شاہ موصوف نقرئی لے کر مدت سے مفقود الخبر ہیں بہر حال وہ کھڑاویں بھی احتیاطاً رکھ لیں کہ "داشتہ آید بکار"!

آخر وہ دن بھی آگیا جس کے لئے دن گنے جا رہے تھے۔ گھڑی میں آدھی رات کا الارم لگا کر سوئے تھے مگر الارم بجنے سے پہلے ہی بیدار

ہو کر الارم کو بجنے کی زحمت سے بچایا۔ راتوں رات نہا دھو کر بن سج کر تیار ہو گئے اور صبح ہوتے ہی گھر سے اپنا سامان اور بیوی کی دعائیں لے کر اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ جب منزلِ مقصد پر شاندار استقبال ہونے والا ہو تو راستہ خواہ مخواہ طویل ہو جاتا ہے اور وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ ہر چند کہ اپنے نزدیک ٹرین میں سوئے بھی۔ مشاعرے میں جو غزل پڑھنے والے تھے اس پر بار بار نظرِ ثانی کی۔ اس کی دھن بٹھائی۔ کئی مرتبہ غسل خانہ میں جا کر آئینہ کے سامنے وہ غزل پڑھ پڑھ کر اپنے کو سنائی۔ داد پر سلام کرنے کے طریقوں کا ریہرسل کیا اور آخر جب منزلِ مقصد قریب آئی تو سوٹ کیس سے برش نکال کر پہلے سیاہ شیروانی کو صاف کیا۔ پھر وارنش کے پمپ کو چمکایا۔ چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں مرتب کیں۔ ہاتھ منہ دھو کر بال بنائے جناح کیپ کے زاویے درست کئے۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آگیا جس پر شعر و ادب کے ایک دیرینہ خدمت گزار کو اس کی خدمات کا صلہ ملنے والا تھا۔ شوق نے کہا مار چھلانگ پلیٹ فارم پر۔ ضبط نے کہا خیر مقدم کرنے والوں کو آنے دو۔ یہی وقت ہے رکھ رکھاؤ کا۔ چنانچہ ایک اخبار لے کر بیٹھ گئے جو اس وقت کسی ایسی زبان کا اخبار معلوم ہو رہا تھا جس کے گویا حرف شناس ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ انجن نے روانگی کی سیٹی دے دی اور اب اس رکھ رکھاؤ کو اٹھانا ہی پڑا۔ ہولڈال پلیٹ فارم پر پھینکا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لیا اور پلیٹ فارم پر آ گئے۔ جہاں حدِ نظر تک نہ اس عظیم الشان مشاعرے کی مجلسِ انتظامیہ کے ممبر تھے۔ نہ پھولوں کے ہار لئے ہوئے مشاعرے کے

رضاکار۔ نہ فوٹوگرافر۔ اخبار پر تاریخ دیکھی کہ کہیں مارے شوق کے ایک دن پہلے تو نہیں آ گئے۔ اسٹیشن کا نام پڑھا کہ کہیں غلط جگہ تو نہیں اتر گئے اور جب ہر طرح سے اطمینان کر لیا تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک صاحبزادے نے قریب آ کر کچھ سونگھنے کے انداز سے کہا۔

"جناب لاہور سے تشریف لائے ہیں؟"

عرض کیا:- جی ہاں حاضر تو ہوا ہوں لاہور سے) یہاں ایک مشاعرہ ہے" وہ بات کاٹ کر جلدی سے بولے "او ہو" میں آپ کو بڑی دیر سے ڈھونڈھ رہا تھا اور اب تو مایوس ہو چلا تھا۔ بہر حال تشریف لائیے" اور ایک قلی سے ارشاد فرمایا کہ سامان اٹھائے۔

اسٹیشن سے جائے قیام تک ایک ایسے تانگے پر لائے گئے جس کا گھوڑا غالباً سودا کے گھوڑے کی نسل کا چشم و چراغ تھا۔ اور ٹھہرائے گئے ایک ایسے خانۂ بے تکلف جو تھانوی کی رعایت سے کچھ تھان کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ ہم تو دم بخود تھے مگر یہ سودا کے گھوڑے کی نسل کا گھوڑا وفور مسرت سے ہنہنا رہا تھا۔ اسٹیشن پر جس سناٹے کے ساتھ خیر مقدم ہوا تھا اس کے معنی یہ پیدا کیے تھے کہ اسٹیشن پر استقبال مناسب نہ سمجھا گیا ہوگا اور طے ہوا ہوگا کہ جائے قیام پر گارڈ آف آنر کا معائنہ کرایا جائے۔ مگر یہاں بھی ایسی ویرانی سی ویرانی تھی کہ دشت کو دیکھ کر گھر یاد آ رہا تھا بڑی دیر کے بعد ایک صاحب دانت نکالے اور ناک ضبط کیے ہوئے تشریف لائے۔ آداب عرض۔ تشریف لائیے" بڑی لیٹ ہو گئی آج گاڑی"

کاش ان حضرت کو معلوم ہوتا کہ گاڑی سے زیادہ وہ تانگہ لیٹ ہوا تھا جس کا گھوڑا عروض کی پابندی کے ساتھ ہر قدم ناپ تول کر اٹھاتا تھا۔

ان حضرات نے نہایت بے تکلفی سے فرمایا "میری رائے میں مشاعرے کے بعد ہی طعام کا بندوبست کیا جائے اس لئے کہ کافی دیر ہو چکی ہے۔

عرض کیا "جی ہاں یہی مناسب ہوگا"!

وہ حضرت بولے یہ رہا مشاعرہ دس قدم پر تو ہے ہی تشریف لائیے آگے آگے وہ حضرت اور پیچھے پیچھے یہ خاکسار۔ اس گلی میں داخل ہو کر اس گلی میں برآمد ہوئے اور اس گلی سے مڑ کر پھر ایک گلیارے میں پہونچے یہاں تک کہ گلیاں بھی ختم ہوگئیں اور ایک سپاٹ میدان شروع ہو گیا جس کے ایک گوشے میں کچھ شامیانہ سا نظر آیا۔ کچھ روشنی بھی تھی اور زندگی کے کچھ ایسے آثار تھے جیسے کسی جنازے کی آمد پر قبرستان میں نظر آتے ہیں۔ ابھی ہم لوگ دس پانچ قدم ادھر ہی تھے کہ ایک صاحب نے لپک کر ہمارے رہنما سے پوچھا "کیوں بھئی آ گئے وہ حضرت یا لعنت بھیجی جائے۔

رہنما نے انگشت شہادت لبوں پر رکھ کر آنکھ سے کچھ ایسا اشارہ کیا کہ وہ حضرت کچھ ٹھٹھک کر رہ گئے اور نہایت منافقت سے فرش راہ ہوتے ہوئے بولے "تشریف لائیں حضور بڑا انتظار کرایا آپ نے غالباً ٹرین کافی لیٹ تھی" اور حضور جی ہاں۔ اور جی نہیں قسم کے واجبی جواب دیتے ہوئے پنڈال میں پہونچ گئے۔ جہاں کسی کے اشارے پر پنڈال تالیوں سے

گونج اٹھا۔ یہ تالیاں اس کس مپرسی کے عالم میں بڑی غنیمت محسوس ہوئیں اور وہ احساسِ کمتری جو خودکشی کی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ ان تالیوں میں جیسے اڑ سا گیا۔ ابھی پنڈال تالیوں سے گونج ہی رہا تھا کہ ایک خلال نما نوجوان نے مائیکرو فون کے قریب جا کر حاضرین کو مخاطب کیا۔

حضرات، ہمیں افسوس ہے کہ ٹرین کے اتفاقاً لیٹ ہو جانے کی وجہ سے ہمارے مہمانِ محترم دیر سے پہنچے اور آپ کو انتظار کی صبر آزما گھڑیاں گذارنا پڑیں حضرات اگر یہ عام مشاعرہ ہوتا تو آپ کی ضیافت طبع کے لئے ہم دوسرے شعراء کو پیش کرتے رہتے اور یہ وقت کشمکش انتظار میں یوں نہ کٹتا مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ مشاعرہ قائداعظم میموریل فنڈ کے لئے منعقد کیا گیا ہے ارادہ یہ تھا کہ اس کی کل آمدنی اخراجات وضع کر کے اسی فنڈ میں دیدی جائے گی ہم نے اس مشاعرہ کے لئے شعراء کی اچھی خاصی فہرست بنائی تھی مگر باوجود اس کے کہ ہم نے متعدد خطوط لکھ کر اپنے اس مہمان محترم کو جو تشریف لائے ہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس مقصدی مشاعرے کی شرکت میں تجارتی لین دین سے کام نہ لیں۔ موصوف اپنے گرانقدر مطالبے سے قطعاً نیچے نہ اترے اور آخر ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ منہ مانگی رقم آپ کو پیش کر دی جائے خواہ کسی اور شاعر کو ہم نہ بلا سکیں۔" بھرے پنڈال سے نعرہ بلند ہوا۔ "شرم شرم"

اور ہم نے محسوس کیا کہ ہم کچھ ڈوب سے رہے ہیں۔ مقرر کی تقریر جاری تھی حضرات ہمارا اور آپ کا فرض اب یہ ہے کہ اپنے مہمانِ محترم پر قناعت کریں اور پورا وقت آپ ہی کو دیکر آپ کا کلام ذرا تفصیل سے سنیں۔"

ہم کو محسوس ہوا گویا ہم مشاعرے میں نہیں بلکہ ہوائی جہاز پر سفر کر رہے ہیں اور جہاز اس وقت بادلوں کے اوپر پرواز کر رہا ہے۔ اسی وقت خدا جانے کس بزرگ نے سہارا دیکر ہم کو مائیکروفون کے قریب لاکر کھڑا کیا اور ہم نے بہت کچھ سنبھل کر ایک غزل شروع کی جس کا پہلا مصرعہ اسی غزل کا تھا جو ہم پڑھنا نہ چاہتے تھے مگر دوسرا مصرعہ اس غزل کا تھا جو ہم پڑھنا چاہتے تھے یعنی دوسرا مصرعہ اس غزل کا تھا جو خدا جانے اس وقت کیوں یاد آگئی تھی۔ پنڈال قہقہوں اور تالیوں سے گونج رہا تھا معلوم نہیں کس خدا ترس کو ہم پر رحم آیا اور ہمارے سامنے پانی کا گلاس پیش کیا گیا اس عرصہ میں سکریٹری صاحب مشاعرہ نے سامعین کو شرافت کے چند درس دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ چپ ہو گئے اور پانی پینے کے بعد ہم نے بجائے غزل پڑھنے کے اعلان کیا۔

"حضرات میں نے اس مشاعرہ کمیٹی سے جو مطالبہ کیا تھا اس کے لئے میرا ارادہ یہ تھا کہ میں وہ کل رقم اپنی طرف سے قائدِ اعظم میموریل فنڈ میں پیش کر دوں گا چنانچہ سکریٹری صاحب مشاعرہ سے درخواست کروں گا کہ وہ رقم میری طرف سے اس فنڈ میں شامل کر لی جائے۔"

کسی غزل پر مجھ کو کبھی اتنی داد نہ ملی تھی جتنی اس اعلان پر ملی اور پھر جو غزل پڑھی مقبول ہوئی۔

(ماہِ نو کراچی)

اگر میں تھانیدار ہوتا

جمنا مہاراج ! جمنا مہاراج "

جمنا مہاراج :- "کون ہے بھیا "

"ارے مہاراج نکلو تو سہی ۔ میں ہوں پرشادی "

جمنا مہاراج :- کون پرشادی بھیا ۔ کہو کیسے درشن دئے ۔؟"

پرشادی :- ارے درشن ورشن نہیں دیئے وہ دیکھو تمہارے کھیت میں ایک گھوڑا جانے کہاں سے گھس گیا ہے اور سب کھیت ٹھکانے سے لگائے دیتا ہے "

جمنا مہاراج :- کیا کہا گھوڑا ؟ لانا تو میری لاٹھی "

پرشادی :- دوڑو جلدی سے وہ تو نہ جانے کب سے کھیت کو کھلیان بنا رہا ہے "

جمنا مہاراج :- پرشادی بھیا تم ادھر سے گھیرو اور میں ادھر سے ہنکاتا ہوں وہ لاٹھی دی ہو کہ آج ہی ساڑھے تین ٹانگ کا ہو جائے "

پرشادی :- "پہلے پکڑ لو اس کو پھر ذرا کٹائی کی جائے "

جمنا مہاراج :- مگر ہے وہ کدھر "

پرشادی :- وہ دیکھو وہ !

جمنا مہاراج :- وہ ؟"

پرشادی :- ہاں ہاں وہ کیا ہے "

جمنا مہاراج :- ارے بھیا وہ تو داروغہ جی کا گھوڑا ہے بس چپکے سے ہنکا دو داروغہ کا ارنا نہیں !

پرشادی :- کیا کہا داروغہ جی کا گھوڑا ہے تو بھیا تم ہی ہنکا دو "

جمنا مہاراج :- تو کیا ہنکایا بھی نہ جائے اس کو !

پرشادی :- تم جانو مہاراج ہم تو اس گھوڑے سے کچھ نہ بولیں گے "

جمنا مہاراج :- کیوں نہ بولو گے !"

پرشادی :- ارے ہاں کون حاکموں کی بات ہیں. وے داروغہ جی ہمارے مالک ہیں بھلا ہماری یہ مجال ہے کہ ہم ان کے گھوڑے سے بولیں !

جمنا مہاراج :- اچھا اچھا وہ دیکھو نہ تم ہنکاؤ نہ میں وہ تو خود ہی کھیت سے نکل گیا "

پرشادی :- چلو چھٹی ملی !

جمنا مہاراج :- مگر بھیا آج یہ معلوم ہو گیا کہ تم بھی داروغہ جی سے بہت ڈرتے ہو "

پرشادی :- ڈرتے نہیں ہیں مگر ہاں یہ بات ہے کہ وہ بہت بڑے حاکم ہیں ارے مہاراج ہم تو ہم زمیندار صاحب ان کا رعب مانتے ہیں اور سچ پوچھو تو ان سے بڑا حاکم ہے کون اب "

جمنا مہاراج :- سچ کہتے ہو بھیا مگر یہ تو بتاؤ کہ اگر تم کو داروغہ جی بنا دیا جائے تو تم کیا کرو "

پرشادی :- کیا بات کرتے ہو مہاراج تم بھی کوئی سنے تو کہے کہ دارو پی گئے ہیں "

جمنا مہاراج :" پھر بھی آخر یہ بتاؤ کہ تمہاری تھانیداری کیسی ہو"

پرشادی :- مہاراج سچ جانو کہ اگر ہم کو درونہ بنا دو تو ہم دکھا دیں کہ درونہ ہوتا کیا ہے ہم ان درونہ کی جگہ ہوتے تو آج سب کہتے کہ ہاں یہ ہوا درونہ"

جمنا مہاراج :- وہ کیسے بھلا "

پرشادی :- وہ ایسے کہ ہماری درونائی میں تھانے پر دن رات بس ڈانٹ ڈپٹ ۔لکھا پڑھی ۔پہرہ چوکی نہ ہوتا ۔ہاں موقع موقع سے یہ باتیں ہو جایا کریں ہنیں تو ہم بھائی برادری کو تھانے میں جمع رکھتے اور سب کے بیچ میں درونہ بنکر بیٹھتے رنگ رلیاں ہوتیں گانا بجانا کھانا ۔پینا پلانا ہوا کرتا ۔اور یہ معلوم ہوتا کہ جانو ہر وقت تھانے میں کوئی برات ٹھہری ہے ۔

جمنا مہاراج :- یہ وزن ہوتے پرشادی بھیا "

پرشادی :- اور نہیں تو کیا ہم بھی درونہ جی کی طرح ہر وقت کمر کسے بیٹھے رہتے ۔اور راتوں کو دربدر گشت کرتے ۔

جمنا مہاراج :- تو یہ کہو کہ ریاست ہوتی تمہاری تھانیداری بھی "

پرشادی :- اب تم ہی دیکھو مہاراج کہ اتنا بڑا حاکم جس کو زمیندار تک جھک جھک کے سلام کریں ہر وقت دوڑا دوڑا پھرتا ہے ۔نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام یہ بھی کوئی حاکم ہونے کی نشانی ہے ۔ہم تو بس اپنے چھپر کھٹ پر نائی سے پیر دبواتے اور ناریل گڑگڑاتے ہر وقت جنگل میں منگل ہوتا ۔تھانے میں

بکوان پکتے ہم بھی خوش رہتے اور ہمارے سپاہی بھی۔

جمنا مہاراج :۔ یہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ کہ جب تمہارا کوئی حاکم پوچھتا تو کیا جواب دیتے۔"

پرشادی :۔ ہمارا حاکم کون ہوتا ہم خود سب کے حاکم ہوتے۔ اور جو کوئی ہماری بات میں ٹانگ اڑاتا تو پھر تم جانو کہ اس کو بندھوا کر ڈنڈا مہاراج سے خبر لی جاتی۔

جمنا مہاراج :۔ تو یہ کہو کہ تمہارا کوئی حاکم ہی نہ ہوتا!

پرشادی :۔ کیسی باتیں کرتے ہو مہاراج ورنہ کا بھی کوئی حاکم ہو سکتا ہے۔ ارے مہاراج زمیندار تک سلام کرتا ہے اور کسی کو کیا کہیں!

جمنا مہاراج :۔ تو بھیا ان رنگ رلیوں میں چوری چکاری بھی خوب ہوتی۔

پرشادی :۔ چوری چکاری کی تو بات یہ ہے کہ ہم نے سب سے صاف صاف کہہ دیئے کہ جو کوئی کسی چور کو پکڑ کے ہمارے پاس لے آئے تو ہم خود گلے گلے پانی اس کے لئے تیار ہیں کہ مارتے مارتے بھرکس نکال دیں مگر جو کوئی ہم سے یہ کہے کہ چوری کر کے بھاگ جائے اور ہم اس کے لئے دوڑے دوڑے پھریں تو صاف بات یہ ہے کہ ہم ٹھہرے حاکم کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں!

جمنا مہاراج :۔" ہاں یہ تو قاعدے کی بات ہے مگر بھیا یہ بھی تو سمجھو کہ پولیس کا کام یہ ہے کہ رعایا کو چوروں سے بچائے بدمعاشوں سے بچائے اور ان کی جان اور ان کے مال کی رکھوالی کرے!

پرشادی :۔ یہ سب جھگڑا ہے مہاراج ہم حاکم ہو کے یہ نوکری

نہیں کر سکتے۔ ہاں چور کو پکڑ لاؤ تو سزا دینا ہمارا کام۔ جتنی کہو سزا دیدیں اور جس کو کہو سزا دیدیں مگر اس کے لئے مارے مارے پھرنا ہم حاکموں کا کام نہیں ہو سکتا"!

جمنا مہاراج:۔ "مگر پرشادی بھیا تمہاری درو غائی میں گاؤں والوں کا نوراج ہوتا"۔

پرشادی:۔ "بھلا مہاراج یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ مگر ایک بات ہے کہ سب گاؤں والوں کا راج نہیں ہو سکتا تھا ابھی کل کی بات ہے کہ نتھا چمار نے ہمارے بیل کو ذرا سا سینگ مارنے پہ لاٹھی مار دی۔ ہم بھیا چپ ہو رہے ہیں کہ کون اس کے منہ لگے لیکن اگر درو غہ ہوتے تو بس پھانسی ہی دیدیتے دو تین برس کی۔ ہاں جو گاؤں والے ہمارے بھائی برادری کے ہیں اور بھائی برادری رکھتے ہیں ان کے لئے ہماری درو غائی میں راج ہوتا۔

جمنا مہاراج:۔ "اور جو ہم اس وقت تمہارے گھوڑے کو اپنے کھیت سے مار کے نکال دیتے تو۔

پرشادی:۔ "یہ بات تو ذرا بیڈھب کہی"

جمنا مہاراج۔ نہیں نہیں سچ سچ بتاؤ کہ تم کیا کرتے"

پرشادی:۔ "سچ پوچھو تو ہم کو مہاراج بڑا غصہ آتا اور تمہارا کھیت روندوا دیتے گھوڑوں سے"!

جمنا مہاراج:۔ "یہ بات ہے کہ تم ہمارے درو غہ جی سے اپنے

ڈرے کہ اُن کے گھوڑے کو بھی نہ ہنکایا؟"

پرشادی :- ہاں مہاراج کون حاکموں کے گھوڑوں سے بولے"

جمنا مہاراج :- تو بھیّا تمہاری داروغائی سے یہی داروغائی اچھی ہے کہ ہم نے بیسوں دفعہ اس گھوڑے کو مار مار کر نکالا ہے مگر ہمارا کھیت آج تک گھوڑوں سے روندا نہیں گیا۔

پرشادی :- سچ کہو کیا تم نے داروغہ جی کے گھوڑے کو مارا بھی ہے"

جمنا مہاراج :- " ہمارا کھیت خراب کرے تو کیوں نہ ماریں"

پرشادی :- تو بھیّا تم داروغہ ہو سکتے ہو ہم نہیں"

جمنا مہاراج :- " یہ بھی ایک ہی کہی پرشادی بھیّا تم نے — ہاہا —"

پرشادی :- " ہاں دادا۔ یہ ہمارا بوتا نہیں کہ داروغہ کے گھوڑے کو ماریں — ہاہاہا"

سُسرال

گیدڑ کی جب موت آتی ہے وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے شہری کی جب شامت آتی ہے تو وہ دیہات میں شادی کر لیتا ہے۔ یہ شامت ہمارے بھاگ میں بھی تھی۔ خیر یوں تو ہم بھی کون سے کلکتہ بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ مگر پھر بھی شہر میں رہے سہے۔ شہر میں پڑھے لکھے بیچے ہو گئے شہری اور لگے دیہات سے گھبرانے مگر بڑے بول کا سر تو نیچا ہو کر ہی رہتا ہے۔ آخر پھر اسی دیہات میں بیوی کی بھیک مانگتے ہوئے پہو نچے اور بہت کچھ دوڑ دھوپ کے بعد موضع بھدبیل کے زمیندار صاحب نے ہم کو اپنی غلامی میں لے لیا۔

ہمارے یہ سسر صاحب بڑی آن بان کے زمیندار ہیں اور انسان تو ایسے ہیں کہ اگر شہر میں آجائیں تو لوگ ان کو دُور دُور سے دیکھنے آئیں ایک سہے ان کے پاس لٹھ۔ جو ہم سے کچھ ہی پتلا ہو گا دو ڈھائی سیر تو لوہا اس میں جڑا ہوا ہے اور کوئی آدھ سیر کے قریب چاندی۔ ہم نے ایک مرتبہ اگر اس لٹھ کو مگدر کے طور پر اٹھایا تو ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر اس لٹھ کو ہم روز سویرے دو ایک مرتبہ اٹھا لیا کریں تو اس سے سینہ بھی بڑھے گا اور

بازو کے پٹھے بھی چوڑے چکلے پہلوانوں جیسے ہو جائیں گے۔ دوسری چیز ہے ہمارے سسر صاحب کا جوتا جو دور سے تو ہوائی جہاز معلوم ہوتا ہے۔ قریب جائیے تو فرنیچر کے قسم کی کوئی چیز دکھائی دیتی ہے اور جب بالکل پاس پہونچ کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس گاؤں بھر کے لوگوں نے الگ الگ جوتے بنوانے کے بجائے ایک ہی جوتا بنوا لیا ہے اور سب اس کو ایک ساتھ پہنتے ہونگے اگر یہ جوتا ہم کو مل جائے تو ہم اس سے سوٹ کیس کا کام نکالیں۔ ان دونوں چیزوں سے یہ اندازہ تو ضرور ہو سکتا ہے کہ ہمارے سسر صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ ہمارے ایسے لوگ تو بھنگے ہیں انکے سامنے۔ اللہ ہماری نظر بد سے بچائے دیو کے دیو ہیں منھ میں بالٹی لگا کر کھڑے کھڑے پانچ چھ سیر دودھ پی جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تھے تو شہر کے کسی ڈاکٹر نے کہدیا تھا کہ آپ گن کر روٹیاں کھایا کیجئے تو وہ بیچارے گن کر پچیس تیس روٹیاں کھا جاتے تھے۔ ان کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ پہلی مرتبہ تو ان کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھکر ہم ایسا سمجھے تھے کہ یہ طے کر لیا تھا کہ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ مگر ان کی لڑکی سے ہم قیامت تک شادی نہیں کریں گے نہ جانے یہ کس دن ہم کو اٹھا کر منھ میں رکھ لیں مگر اب عادت پڑ گئی ہے دیکھتے دیکھتے۔

یہ تو سب کچھ ہے مگر سسر صاحب اگر دنیا میں کسی کی بات مانتے ہیں تو وہ ہماری۔۔ کہتے ہیں کہ شہر کا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ مڈل سے بھی آگے تک پاس ہے اس کی بات نہ مانیں گے تو کیا ننکو کی بات مانیں گے جس نے

شہر میں جا کر کھیتوں کا مقدمہ ہی نہ جانے کیا الٹی سیدھی بات کر کے ہرا دیا۔

خیر اب سسر صاحب کی ایک ایک بات کہاں تک بیان کی جائے اس کے لئے تو ایک الگ کتاب لکھنے کا خود ان ہی سے وعدہ کر چکے ہیں مگر اس وقت ان کی چھوٹی لڑکی کے بیاہ کا حال سن لیجئے کہ وہاں کا کیا حال تھا اور ہم پہ کیا گذر رہی تھی۔ ہم کو بہت دن پہلے سے موضع مجھد نسیل بلا لیا گیا تھا اور ایک ایک بات ہم سے پوچھ کر کی جا رہی تھی اصل میں یہ شادی بھی خود ہم ہی نے ٹھہرائی تھی۔ ہمارے ایک دوست تھے اور ہم چاہتے تھے کہ شہر میں ہماری طرح کا ایک آدھ دیہاتی داماد اور بڑھے۔ ہمارے سسر صاحب کو تو بس اتنا ہی اطمینان کافی تھا کہ یہ شادی ہم نے ٹھہرائی تھی مگر ہمارے دوست کی جان پر بنی ہوئی تھی کہ اگر اس کم بخت نے زندگی بھر کا مذاق کر دیا تو کیا ہوگا۔ وہ گئے ہم تو بہر حال یہ تھا کہ ہم سسر صاحب کے اس اطمینان کا خون کرنا ہی نہیں چاہتے تھے اور اپنے دوست سے مذاق کرنے کی نیت بھی نہ تھی۔ البتہ یہ ڈر ضرور لگ رہا تھا کہ معلوم نہیں دیہات کی کس بات کو مذاق سمجھ بیٹھیں اب ہماری سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ دلہن کو ہاتھ کا کتا اور ہاتھ کا بُنا جو جہیز دیا جانے والا تھا وہ کسی طرح ٹل جائے تو اچھا ہے اس لئے کہ خود ہماری بیوی کے جہیز میں جو کرسی آئی تھی اس کو ہم بہت دنوں تک گھڑونچی سمجھتے رہے اور جب پتہ چلا کہ یہ کرسی ہے تو گاؤں گئے تھے۔ سسر صاحب سے پوچھنے کہ اس پہ بیٹھنے کا طریقہ کیا ہے۔ مطلب یہ کہ انھیں تمام باتوں سے ہم

اپنے دوست کو بچانا چاہتے تھے اور بچانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی وہاں دھڑادھڑ زیور پر زیور ڈھل رہے تھے۔ جن میں سے ایک بھی اس قابل نہ تھا کہ اس کو زیور سمجھ کر پہنا جا سکے۔ شہر میں ان چیزوں سے ورزش کی جاتی ہے آخر ہم کو دخل دینا ہی پڑا اور ٹھیک اس موقع پر جبکہ ہمارے سسر صاحب ڈھائی تین سیر کی ایک جھانجھ لئے ہوئے اپنے نیم سے کہہ رہے تھے کہ ہلکی رہی یہ ہم سے ضبط نہ ہو سکا اور ہم نے سسر صاحب سے پوچھ ہی لیا۔ بھائی ابا یہ کیا ہے ہم ان کو بھائی ابا اس لئے کہتے تھے کہ ہماری بیوی ان کو یہی کہتی تھیں ہمارے سوال پر جھانجھ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "جھانجھ ہے بھیا۔ پر میں یہ کہتا ہوں کہ یا تو چیز نہ دی جائے اور یا دی جائے تو ایسی کہ ناک نہ کٹے"
ہم نے دبی زبان سے کہا "ناک نہ کٹے" چاہے پیر ٹوٹ جائے"
چونک کر بولے "ہائیں! پیر کی کیا بات ہوئی!" ہم نے ان کو سمجھانے کے لئے آگے کھسک کر کہا "بھائی ابا یہاں آپ لوگ زیور کو تو دیکھتے ہیں اور اس بیچاری کو بھول جاتے ہیں جس کو زیور پہننا ہے اب آپ ہی بتائیے کہ یہ جھانجھ، پھر اس کے بعد کڑے، پھر چھڑے اور ایسی ایسی نہ جانے کیا کیا چیزیں پہننے کے بعد اس غریب کا پیر بھی اٹھ سکے گا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو چیز آپ دینا چاہتے ہیں وہ کم سے کم ایسی تو ہو کہ جو اس کے کام آ سکے۔ شہر میں بیاہ کر جا رہی ہے۔ زیور ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی شہر والوں کا بھی دم نکل جائے اور دولہا کو بھی دھڑکن ہونے لگے۔

جب سے میں آیا ہوں چپکے چپکے تمام انتظام دیکھ رہا ہوں اور دل ہی دل میں ہنس رہا ہوں کہ آخر آپ کا ارادہ کیا ہے. جہیز کا جو سامان آپ تیار کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے کم سے کم ایک پوری ریل گاڑی کی ضرورت تو ہوگی جو اس لڑائی کے زمانے میں تو مل نہیں سکتی ۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں جو لڑائی کی وجہ سے لوگ اپنے کو ہلکا پھلکا رکھنا چاہتے ہیں آپ اپنی لڑکی اور داماد کے اوپر بوجھ لاد رہے ہیں جس کو لے کے کہیں نہ آیا جا سکے نہ جایا جا سکے دیجئے تو ایسی چیز دیجئے کہ جس سے لڑکی بھی فائدہ اٹھا سکے داماد بھی خوش ہو اور دیکھنے والے بھی دیکھیں کہ عقل صرف شہر میں نہیں بٹی ہے دیہاتوں میں بھی پہونچی ہے"۔ چنانچہ ایک طرف رکھ کر سر سے پیر تک سوالیہ نشان بن گئے اور گل مچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولے "تو بتاؤ نا بھائی آخر میں نے تو سب کچھ تم پر چھوڑ ہی رکھا ہے اب میں شہر والوں کی سی انگریزی پڑھی عقل کہاں سے لاؤں"، ایسے میں سویرا ہے — اب بھی جو کہو وہ کیا جائے گا"۔ ہم نے کہا "پہلے یہ بتائیے کہ آپ کا ارادہ جہیز پر کتنا روپیہ صرف کرنے کا ہے ایک دم سے ڈنکار کر منیم کو پکارا کہ بڑے بھیا کے بیاہ کا کھاتہ لاؤ اور ہم سے کہنے لگے. میرا خیال یہ ہے بلکہ جہاں تک یاد پڑتا ہے ساڑھے تین ہزار کا جہیز تمہاری بیوی کو دیا تھا بس اسے کے لگ بھگ سمجھ لو"۔ ہم نے کہا بس تو ٹھیک ہے. آپ یہ تمام روپیہ جنگی قرضے میں دے کے اس کے سرٹیفکٹ جہیز میں دے دیجئے"۔ سسر صاحب پر ایک دم بجلی سی گری تڑپ کر بولے "ہائیں! کیا کہا؟ ارے بھائی اردو میں سمجھاؤ نا"

ہم نے منھ پھیر کر مسکرانے کے بعد کہا "مطلب یہ ہے کہ یہ روپیہ تو دے دیجئے سرکار کو قرض اور اس کی پکی رسید لڑکی کے حوالے کر دیجئے جب لڑائی ختم ہو جائے گی تو اسی روپیہ سے جو منافع کے ساتھ واپس ملے گا وہ اپنی مرضی کا جو چاہے گی بنوائے گی" آج غالباً پہلی مرتبہ ان کو اس بات کا افسوس ہوا کہ ان کی بڑی لڑکی کی قسمت ایک پاگل کے ساتھ پھوڑی گئی ہے کہنے لگے "کیسی باتیں کرتے ہو بھیا نہ جانے لڑائی کا اونٹ کس کل بیٹھے. کون جیتے کون ہارے پھر کس کو رسید دکھا کر روپیہ مانگتے پھریں گے.

ہم نے ان کو سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھئے اس کو یوں سمجھئے. کہ اول تو ہم جیت رہے ہیں اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی رقموں اور ذرا ذرا سی امداد ریوں کے بل بوتہ پر جیت رہے ہیں اور فرض کر لیجئے کہ نہ بھی جیتیں تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام سامان، یہ تمام زیور اور یہ سب کچھ جو آپ جہیز میں دے رہے ہیں باقی بچ جائے گا دشمن کی لوٹ مار اس کو باقی رہنے دے گی. بم کے گولے کسی چیز کو استعمال کے قابل رہنے دیں گے. یا استعمال کرنے والوں کو صحیح سلامت چھوڑیں گے. اس وقت تو آپ کے اسی روپیہ سے دشمن کو پیچھے ہٹایا جا سکتا ہے. اور اگر یہی روپیہ ہم گھروں میں دبا کر رکھ لیں تو وہ نہ تو ہمارے کام آئے گا اور نہ سرکار کے کام بلکہ دشمن لٹیرے اس کو یا تو لوٹ لیں گے یا تباہ کر کے رکھ دیں گے" اتفاق کی بات تھی کہ یہ باتیں کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آ رہی

تھیں کہنے لگے بات تو کچھ جچتی ہوئی ہے۔ پر یہ تو سوچو گاؤں والے کیا کہیں گے برادری کیا تھوکے گی، سب یہی کہیں گے نا کہ ونڈیا کو ایک کاغذ تھما دیا اور چلتا کیا" ہم نے کہا" برادری میں سب سے بڑے بزرگ آپ ہیں اور گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار بھی آپ ہیں۔ اگر آپ ہی ایسی مثالیں قائم نہ کریں گے تو کون کرے گا" مٹھی میں اپنی داڑھی کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا" ہوں" کچھ دیر کے بعد ارشاد ہوا" ہوں ہوں اور آخری غوطہ کے بعد جو ابھرے تو گھٹنے پہ طبلے کی کوئی گت بجاتے ہوئے فرمایا" اچھا۔ تو میں کل جواب دوں گا ذرا تمہاری ساس داس سے بھی پوچھ لوں۔ ساس تک غنیمت تھا مگر یہ داس بڑی خطرناک چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گاؤں بھر کی بڑی بوڑھیوں کا مشورہ لیا جائے گا۔ جو سب کی سب ہماری داس تھیں۔ مگر بڑے میاں کو ہم ایسا رام کر چکے تھے کہ دوسرے دن تک تمام ساسیں اور تمام داسیں لاکھ چیخیں چلائیں مگر ہم کو صبح ہی ساڑھے تین ہزار روپے مل گئے کہ شہر جا کے ان کو جمع کرو اور پکی رسید لا کے دکھاؤ۔

دیمک

خدا جانتا ہے جس دیمک کا میں ذکر کر رہا ہوں، اُس نے کتابوں کے صفحات نہیں بلکہ خود میرا کلیجہ چھلنی کر دیا ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ دیمک کی اس قسم سے میں کتابیں کیونکر محفوظ کروں۔ صاحب اگر یہ بھی وہی دیمک ہوتی جو عام طور پر کتابوں کو لگ جایا کرتی ہے۔ تو میں بھی کولتار سے کتابوں کی الماری پیوا دیتا نیم کی پتیاں الماری کے تختوں پر بچھا کر اُن پر کتابیں رکھنا شروع کر دیتا۔ کتابوں کو ماہ بماہ دھوپ کھا دیا کرتا۔ مختصر یہ کہ بے شمار ترکیبیں ہیں کتابوں کو دیمک سے بچانے کی مگر اس قد آدم دیمک کا کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا جو میرا کتب خانہ چاٹے جا رہی ہے اور جو علاج سمجھ میں آتا ہے اس کا نتیجہ خود اپنے حق میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ اور اندیشہ ہے پھانسی پا جانے کا۔ ورنہ حبس دوام میں تو کوئی شک ہی نہیں۔

کبوتروں کا مجھ کو شوق نہیں۔ بٹیر بازی میں نہیں کرتا۔ مرغ میں نہیں لڑاتا۔ گھوڑدوڑ کی مجھ کو لت نہیں۔ اگر لے دے کر کوئی شوق ہے تو کتابوں کا۔ اپنی گاڑھی کمائی کا بیشتر حصہ کتابیں خریدنے پر صرف کرتا ہوں۔ بیوی بے

رنجش مول لیتا ہوں۔ مگر ان کے لئے بنارسی ساری یا طلائی جھمکے لانے کی جگہ بھی کتابیں ہی خرید لاتا ہوں۔ بچے سمجھتے ہیں کہ ان کی قسمت میں باپ کی محبت اور شفقت ہے ہی نہیں۔ اس لئے کہ میں ان کے لئے کھلونے اور بسکٹوں کے ڈبے تو جب لاؤں کہ کتب فروشوں کی دکانوں پہ کتابیں میسر نہ آئیں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ لے کر سیدھا کتب فروشوں کی دکانوں پہ پہنچ جاتا ہوں اور گھر کے خرچ سے جس قدر زائد رقم ہوتی ہے اس کی کتابیں خرید کر گھر آجاتا ہوں۔ بیوی کے طعنے سنتا ہوں بچوں کی مایوس نگاہیں دیکھتا ہوں مگر عشق میں تو یہی کچھ ہوتا ہے اور مجھ کو اگر کتابوں سے عشق ہے تو یہ باتیں برداشت ہی کرنا پڑتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا کے فضل وکرم سے میرے کتب خانہ میں اس وقت دو ڈھائی ہزار کتابیں موجود ہیں اور میری سب سے بڑی دولت بلکہ میری زندگی کی کمائی یہی کتابیں ہیں۔ کیوں صاحب یہ کتابیں اگر مجھ کو جان سے زیادہ عزیز ہوں تو کیا ہوں وہ کتابیں جن کو میری بیوی اپنی سوت سمجھے۔ وہ کتابیں جن کو میرے بچے سوتیلی ماں کا درجہ دیں۔ مگر خدا کے لئے بتائیے میں اپنی ان ہی عزیز از جان کتابوں کو دیمک کی اس قسم سے کیسے بچاؤں جس نے زندگی وبال کر رکھی ہے۔ صاحب کوئی ایسا ویسا آدمی ہو تو ٹال بھی دوں۔ والد مرحوم کے دوست۔ ہر اعتبار سے نہایت شفیق بزرگ۔ ویسے بھی نہایت سنجیدہ آدمی۔ مگر میرے صاحب جان کے گاہک اس لئے بن گئے ہیں کہ ازراہ حماقت ان کو غریب خانے کے قریب ہی کرایہ کا مکان دلوا دیا ہے۔ بس جناب

جب دیکھئے یہ بزرگ محترم دھرے ہوئے ہیں۔ صاحب اگر وہ پان کھائیں، سگرٹیں پھونکیں، چائے پئیں تو کون کافر ان کی شکایت کرے سعادت مندی کا تقاضا یہی ہے کہ جب وہ تشریف لائیں، مجھ کو دیدۂ و دل فرش راہ کرنا چاہیے جو بحمد اللہ کرتا ہوں۔ ہر چند کہ ان کے تشریف لاکر واپس جانے کے بعد مجھ کو قالین پر برش کرنا پڑتا ہے تاکہ ان کے نعلین کے ساتھ آئی ہوئی کیچڑ صاف ہو جائے۔ ان کے پھیلائے ہوئے چلغوزوں کے چھلکے صاف ہو سکیں، مگر مجھ کو یہ سب کچھ گوارا ہے۔ البتہ اب میں ان کی تشریف آوری سے محض اس لئے کانپنے لگا ہوں کہ ان کو مجھ سے زیادہ میرے کتب خانے سے دلچسپی ہو گئی ہے اور وہ میری کتابوں کے لاگو ہو گئے ہیں۔ جب دیکھئے بھتیجے کا گھر سمجھ کر "السلام علیکم" کا بم رسید کرتے ہوئے تشریف لے آئیں گے اور آتے ہی اس کتاب کی داد دیں گے جو کل لے گئے تھے کہ "بیٹے وہ جو کل میں لے گیا تھا ناول بھئی وہ نہایت فحش نکلا۔ عشاء کی نماز بھی کمبخت نے قضا کرائی اور رات کو تین بجے تک اس نامراد کو پڑھنا بھی پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فجر کے لئے بھی آنکھ نہ کھل سکی مگر لاحول ولا قوۃ کس قدر بیہودہ کتاب تھی وہ۔ آج اس کو تمہاری چچی پڑھ رہی ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ بچوں کی نظر اس پر ہرگز نہ پڑے۔ ذرا الماری تو کھولو شاید میرے مطلب کی کوئی چیز مل جائے"۔ اور یہ کہتے ہوئے خود الماری پر حملہ کریں گے، کتابوں کی تمام ترتیب گڑبڑ کریں گے، کچھ کتابیں نکال نکال کر غلط جگہ رکھیں گے۔

کچھ غلط جگہ بھی نہ رکھیں گے۔ بلکہ کسی صوفے پر کسی کرسی پر یا کسی مونڈھے پر اُچھال دیں گے۔ بیڑیاں پی پی کر ان کے ٹکڑے اِدھر اُدھر اُچھالتے رہیں گے۔ مجھے پان کے لئے اندر بھیجیں گے اور میری عدم موجودگی میں کتابوں کی دوسری الماری کو کباڑیے کی دکان بنا ڈالیں گے اور دو تین کتابیں نکال کر پہلے تو کسی صوفے پر اکڑوں بیٹھ کر اِدھر اُدھر سے دیکھیں گے۔ اس کے بعد نہایت بے تکلفی سے اٹھ کر چلتے چلتے کہیں گے کہ "بیٹے یہ تین کتابیں لئے جا رہا ہوں، پڑھ کر لوٹا دوں گا۔ اور ہاں وہ کل والی کتاب جو نہایت بے ہودہ ہے انشاء اللہ کل آجائے گی"۔

اب بتائیے کوئی ان کو کیسے ٹوکے، والد صاحب کے ملنے والے اور والدہ صاحبہ کی تجہیز و تکفین کے منتظم ٹھہرے۔ کلیجے پر لاکھ سانپ لوٹے۔ کتب خانے کی یہ گت دیکھ کر دل کے خواہ کتنے ہی ٹکڑے ہوں مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان سے کتابیں چھین لی جائیں اب دوسرے دن وہ پھر تشریف لائیں گے۔ تبسم اور چہرے سے شگفتگی کا نور برساتے ہوئے ہاتھ میں وہی بیہودہ ناول لئے "لو بیٹے یہ ناول لے آیا ہوں تمہارا عجیب لطیفہ ہوا اس کا بھی تمہاری چچی پڑھ رہی تھیں کہ میاں شدو کی نظر پڑ گئی اس پر وہ حضرت لے اڑے اسے۔ تمہاری چچی دوڑیں اس کے پیچھے اور کتاب جو چھینی ہے اس کے ہاتھ سے، تو اس کے چند صفحے میاں شدو کے ہاتھ میں اور چند تمہاری چچی کے ہاتھ میں اور سرورق تو پھٹ ہی گیا۔ بہرحال اس کو کسی جلد ساز سے ٹھیک کرا لینا۔

جی تو چاہا کہ کتاب ان بزرگ محترم کے منہ پر مار دی جائے مگر فوراً تصور میں والد صاحب آ گئے کہ ادنا خلف، یہ ارادہ اُس کے لئے ہے جو میرا دوست تھا جس کو میں بھائی جان کہا کرتا تھا، جس نے میری والدہ کے لیے بارہ بجے رات کو بزاز کی دکان کھلوا کر کفن مہیا کیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اور ان حضرت کے جانے کے بعد گوند لے کر پھٹے ہوئے صفحات کو نہایت احتیاط سے جوڑ ہی رہے تھے کہ ان بزرگ محترم کے خلفِ اکبر شدو میاں نازل ہو گئے۔ واہ بھائی صاحب! ایسی مزیدار کتابیں آپ الگ ہی الگ پڑھتے ہیں۔ آپ کی قسم مزہ آ گیا ایک ہی ورق پڑھ کر مگر اماجان فوراً چھین لے گئیں کتاب، میں نے بھی دل میں کہا کہ لے جاؤ میں خود بھائی صاحب سے مانگ لاؤں گا۔

میں نے اُن حضرت سے صاف کہہ دیا: "جی نہیں معاف کیجئے گا میں آپ کو کتاب نہیں دے سکتا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں کتابیں مانگے پر دینے کا اصولاً قائل بھی نہیں ہوں، چچا میاں بزرگ ہیں، اب ان سے میں کیا کہوں، ورنہ میں تو ان کو بھی خوشی سے کتابیں نہیں دیتا!"

وہ حضرت ایسے غیرت دار نکلے کہ کتابوں کی الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولے: "آپ نہ دیجئے۔ میں خود لے جاؤں گا۔ کوئی غیریت تھوڑی ہے۔ آپ کی چیز میرے لئے پرائی تھوڑی ہے!"

مگر میں نے نہایت تلخی سے کہا: "یہ غلط ہے کتابیں تو میں چھونے بھی نہ دوں گا

اور نہ آئندہ کتاب مانگ کر مجھ کو شرمندہ کیجئے گا"

وہ حضرت اپنی بے تکلفی پر پہلے تو کچھ کھسیانی ہنسی ہنسے، اسکے بعد سنجیدگی سے گھورتے رہے مگر جب میرے تیور بدستور رہے تو کہنے لگے "کوئی ہم آپ کی کتاب کھا تھوڑی جاتے۔ ذرا سی کتاب کے لئے آپ نے ٹکا سا جواب دے دیا!"

عرض کیا "جی ہاں آپ اس کا ٹکا سا جواب ہی سمجھیں۔ بہرحال میں کتاب تو اب ہرگز نہ دوں گا۔ وہ حضرت بھوے سو بجے تشریف لے گئے اور مجھے آج پہلی مرتبہ اس بے مروتی پر کچھ فخر سا محسوس ہوا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے بالکل درست کیا مگر تھوڑی ہی دیر میں میر صاحب قبلہ تینوں کتابیں لئے اپنی نورانی آنکھوں سے شکایت برساتے تشریف لائے اور کتابیں ایک طرف اچھال کر بولے "سچ ہے بیٹا وہ مروت کا زمانہ گزر چکا، جب تمہارے والد کے اور میرے درمیان کوئی غیریت نہ تھی۔ میں نے ان کے کپڑے پہنے ہیں۔ انہوں نے خدا جنت نصیب کرے میرے گھر کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھا جو چاہا اٹھا لائے، مگر تم نے آج مجھے سبق دے دیا اور مرنے والے کی روح کو بھی شرمندہ کر دیا!"

میں واقعی کانپ گیا اور میں نے گھبرا کر جھوٹ بولنا شروع کر دیا "چچا میاں یہ بات نہیں ہے۔ شدو میاں وہی کتاب مانگ رہے تھے جسے آپ مخش بتا چکے ہیں اور جسے چچی نے ان کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ میں کیسے دے دیتا ان کو وہ کتاب!!"

میر صاحب کا رنگ فوراً بدل گیا " اچھا یہ بات تھی، مجھ کو تم سے یہی امید تھی بیٹا تم نے بہت اچھا کیا کہ اس کو وہ کتاب نہ دی مگر وہ نامعقول تو کچھ نامعقول باتیں کر رہا تھا کہ گویا تم مجھ کو بھی ناول ناخواستہ کتابیں دیتے ہو۔ مجھے تو یہ سن کر بخدا بڑا قلق ہوا تھا "

اور میں پھر جھوٹ بول گیا " بھلا میں کہہ سکتا تھا ایسی بات۔"

میر صاحب نے مجھ کو گلے لگا کر وہ تینوں کتابیں پھر اٹھا لیں جن کو میں دیکھ رہا تھا کہ ایک کے سرورق پر پان کا بڑا سا دھبہ تھا۔ دوسری کے سرورق پر غالباً تیل کی مالش ہوئی تھی اور تیسری کا سرورق شاید گھی پر پھول آئے تھے۔ مگر میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا کہ کہیں والد صاحب کی روح شرمندہ نہ ہو جائے۔ میر صاحب نہ صرف وہ تین کتابیں لے گئے بلکہ دو کتابیں اور بھی لے گئے اور میں کچھ نہ کہہ سکا۔ جاتے جاتے لوٹ کر میر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ " بیٹے شدومیاں کو تم خود کوئی ایسی کتاب بھیج دو جو اس کے پڑھنے کے قابل ہو اور تمہاری چچی نے کہا ہے کہ اگر اسی ناول کی قسم کی کوئی اور کتاب ہو تو ان کے لیے بھیج دو، معلوم نہیں ان عورتوں کو محض کتابیں پڑھنے کا کیا شوق ہوتا ہے۔ میں نے تو ان سے کہہ دیا ہے کہ کسی وقت برخوردار کے کمرے میں پردہ کرا کے چلی جاؤ۔ اور اپنے مطلب کی کتابیں چھانٹ لاؤ، اس کے پاس کتابوں کی کیا کمی ہے "

میں نے خدا جانے کس طرح ہنس کر کہا " بے شک بے شک "

برقِ جسم

مگر ان کے جانے کے بعد سے مسلسل اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ دیمک
کی اس قسم سے اپنی کتابوں کو کیسے بچاؤں۔ ارادہ ہے کہ یہ ذاتی مکان
کرایہ پر اٹھا دوں، مگر مکان کبھی تو نہیں ملتے نہ جائے ماندن نہ پائے
رفتن۔ خدا ہی حافظ ہے ان کتابوں کا۔

ب

اب میں کیا کہوں ان پنڈت جی کو جنہوں نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ 'ب' کا حرف تمہارے لئے نہایت نحس ہے۔ تمہاری موت کا خواہ کوئی بھی سبب ہو مگر وہ سبب ہوگا 'ب' سے۔ لہٰذا ہر اس چیز سے بچو جس کا نام 'ب' سے شروع ہوتا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک حرف تھا مگر جب احتیاط شروع کی تو پتہ چلا کہ یہ "ب" اس قدر عالمگیر ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ بجلی خواہ وہ بادل میں چمکے یا گھر بلوریں روشنی کی صورت میں ہو خوفناک بن گئی۔ بندوق، بارود، بندر، بن مانس بچھو وغیرہ تو خیر ہیں ہی بیہودہ چیزیں۔ مگر بہن، بھائی، بیوی تک سے جو شخص مطمئن نہ رہ سکے۔ بھتیجوں اور بھانجوں سے جس کو ہر وقت اندیشہ ہو۔ برفی ایسی مٹھائی نہ کھا سکے۔ گرمیوں میں برف سے پرہیز کرے۔ بھوپال اور بمبئی کے نام سے گھبرائے اور کراچی پہونچ کر جس کو یہ خیال ستائے کہ یہ بھی تو بندرگاہ ہے۔ بائیسکل دیکھ کر جس کا خون خشک ہو جایا کرے اور سوتے سوتے جو شخص بستر الٹ کر کھری چارپائی پر لیٹنے کو ترجیح دے۔ بدرالحسن ایسے دوست بخاری ایسے کرم فرما سے الجھن ہو۔ بچوں کو دیکھ کر جسے وحشت ہونے لگے اور بائسکوپ جسے ترک کر دینا پڑے، اس کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ دل کو جیسے یقین سا تھا کہ تاریخ وفات کسی سال میں بھی ہو مگر

یہ طے ہے کہ دسمبر کی بارہ یا بیس یا بائیس ضرور ہو گی۔ اس لئے کہ دسمبر سال کا بارھواں مہینہ ہوتا ہے اور ہر مہینے میں یہ تین تاریخیں ایسی ہوتی ہیں جو 'ب' سے ہوں۔ سنہ باون کے شروع ہوتے ہی صدقہ خیرات شروع ہوا، اور یہ احتیاط رکھی گئی کہ صدقہ کے لئے بکرا نہ آئے مینڈھا آئے تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ دنبہ آجائے، اگر یہ صدقے قبول ہو گئے اور سنہ باون کا بارہواں مہینہ اور اس کی بارہ بیس اور بائیس تین تاریخیں خیریت سے گذر گئیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ سنہ باسٹھ تک کی تو گویا مہلت مل ہی جائے گی، مگر مہلت کیا خاک مل جائے گی۔ ہجری سنہ کے بارہویں مہینے میں بھی یہ تین تاریخیں تو پڑتی ہی ہیں اور ہجری سنہ کی تو ہر تاریخ خطرناک ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی اس 'ب' سے بچ کر کہاں جائے۔ اب آپ کو یقین نہ آئے گا ہر سال عید تو خیر عید ہوتی ہے، مزے سے گذر جاتی ہے، مگر بقر عید قیامت بن کر آتی ہے خدا خدا کر کے جب یہ تہوار گذرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پھر سے پیدا ہوئے ہیں۔ مگر اس 'ب' سے بعض اوقات ایسی مڈبھیڑ ہوتی ہے کہ اب کیا عرض کیا جائے۔ مثلاً حال ہی میں جو واقعہ ہوا ہے وہ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ یہ تو میں عرض ہی کر چکا ہوں کہ سنہ باون مجھ پر بھاری ہے۔ دسمبر یعنی اس سال کا بارہواں مہینہ تو خیر ابھی دور ہے مگر میں ہر مہینے کی بارہ بیس اور بائیس تاریخ کو روزہ رکھ لیتا ہوں اور ذرا نماز بھی علی الحساب پڑھنے لگتا ہوں، اس کے علاوہ ہر دن اور ہر رات کے بارہ بجے ذرا ہوشیار سا ہو جایا کرتا ہوں، گذشتہ اپریل میں یوم اقبال اطراف ملک میں منایا گیا گیا۔ خیریت یہ ہے کہ یوم اقبال اکیس تاریخ کو منایا جاتا ہے یعنی دو خطرناک تاریخوں کے بیچ بیچ۔ بہر حال مجھ کو اکیس تاریخ پر ذاتی طور پر کوئی خاص اعتراض

نہیں۔ مگر چونکہ اطراف ملک کے لئے ایک ہی تاریخ ناکافی ہے۔ لہٰذا تصادم کے خوف سے لوگ مختلف تاریخوں میں بھی یوم اقبال منایا کرتے ہیں چنانچہ کچھ نوجوان دعوتی رقعے لے کر میرے پاس آئے۔ معلوم ہوا کہ بزم ادب بادامی باغ کے کارکن ہیں جس کے زیر اہتمام بیس اپریل کو یوم اقبال کے سلسلے کا مشاعرہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی شرکت کروں۔ دعوت نامہ دیکھ کر خون ہی تو خشک ہو گیا "ب" کی بھرمار تھی۔ بزم ادب میں "ب" بادامی میں "ب" باغ میں "ب" پھر بیس تاریخ۔ دل نے کہا۔ برخوردار یہ موت کا پروانہ ہے۔ گئے نہیں کہ قصہ پاک ہوا۔ سینکڑوں بہانے کر کے ان کو ٹال دیا۔ بائیس اپریل کو بھی ایک مشاعرہ تھا اس سے بھی نجات حاصل کی مگر چوبیس تاریخ کو ایک تقریب محفوظ نظر آئی۔ چنانچہ شرکت کا وعدہ کر لیا۔ شہر کے باہر جانا تھا۔ تاریخ چونکہ محفوظ قسم کی تھی لہٰذا روانگی کے انتظامات مکمل کر لئے ایک معمولی سی احتیاط یہ ضرور کی کہ جو صاحب مدعو کرنے آئے تھے، جب وہ لینے کو آئے تو ان سے عرض کر دیا کہ صاحب میں اصولاً "بس" سے سفر نہیں کرتا یا تو موٹر کا انتظام کر لیجئے، یا ریل سے چلیں گے وہ ریل سے چلنے پر راضی ہو گئے، مگر اب یہ اتفاق ملاحظہ ہو کہ ریل کا وقت بارہ بج کر بیس منٹ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ریل سے چلیں گے وہ ریل سے چلنے پر راضی ہو گئے، ظاہر ہے کہ یہ ریل بھی ایک قسم کی بس ہی ہوئی۔ موٹر کی ان کے بجٹ میں گنجائش نہ تھی اور نہ یہ بات ان کو آسانی سے سمجھائی جا سکتی تھی کہ بارہ بج کر بیس منٹ پہ روانہ ہونے والی ٹرین سیدھی عدم آباد جاتی ہے۔ سوال یہ تھا کہ اب آخر کریں تو کیا کریں۔ ارادہ کیا کہ اختلاج قلب کا ایک شدید دورہ فوراً تصنیف کیا جائے تاکہ یہ صاحب خود ہی نہ لیجائیں گے گر دورہ

شروع ہی کیا ہوا تھا کہ وہ صاحب چکرا کر گر گئے۔ ایک نعرہ بلند کیا "ارے بھائی کوئی ہے۔ فوراً بید مشک لاؤ اور بوتل کا ڈاکٹر بلوا جائے۔ لیجیے یک نہ شد دو شد۔ بید مشک اور بوتل نہ ہو اور وہ بھی ہو اور آنکھ لگنی کہ دونوں اجزا میسر آئے فوراً اس دورے کو ملتوی کرنا پڑا۔ اور ان سے عرض کیا کہ میں ٹھیک تو ہو گیا ہوں مگر اس حالت میں فوراً سفر پر روانہ ہونا مناسب نہیں ہے۔ وہ بھی آدمی معقول نکلے۔ ٹائم ٹیبل دیکھ کر بولے مناسب ہے۔ دوسری گاڑی دو بج کر پندرہ منٹ پر جاتی ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس ٹرین سے سفر کرنے میں کوئی اندیشہ نہ تھا لہذا اس ٹرین سے روانہ ہو گئے اور جب گاڑی چل دی تو ٹریجڈی شروع ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اب تک تو کچھ رسمی تکلفات کی وجہ سے کچھ اختلاج کے دورے کی وجہ سے ان حضرت سے تفصیلی گفتگو ہی نہ ہوئی تھی۔ اب جو ٹرین میں اطمینان سے بیٹھے تو ان حضرت سے کہا۔

بھئی معاف کیجئے گا میں نے اب تک یہ نہیں پوچھا کہ جناب کا اسم مبارک کیا ہے؟

وہ کھسیں نکال کر بولے "بندے کو بشیر بیگ کہتے ہیں"۔

ایک دم جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔ بشیر اور پھر بیگ سفر میں ایک چھوڑ دو "ب" ساتھ ہیں۔ یہاں یہ احتیاط کہ بیگ، یا بستر اور بکس تک ساتھ نہیں لیا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ بستر اور بیگ کے بجائے بشیر بیگ مل جائیں گے۔ گھبرا کر پوچھا!

"اور تخلص کیا فرماتے ہیں جناب"۔ خیال آیا کہ تخلص ہی کے سہارے یہ سفر طے کر لیں گے۔ ان حضرت نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا۔

"— بسمل کہتے ہیں خاکسار کو"۔

جی چاہا کہ خطرے کی زنجیر کھینچ لیں۔ یعنی بدتمیزی ملاحظہ ہو کہ تخلص تک آپ کو 'ب' کے علاوہ اور کوئی نہ ملا۔ بیوقوف کہیں کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ضرور سفرِ آخرت ہے اور یہ شخص جس کے ایک ہی نام میں تین 'ب' موجود ہیں یقیناً ملک الموت ہے۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو بقرعید کے دن یا شروع کے ہر مہینے کی بارہ بیس اور بائیس تاریخوں کو یا ہر روز کے بارہ بجے اور ہر رات کے بارہ بجے طاری ہوا کرتی ہے۔ ان حضرت کو میرے محسوسات کی کیا خبر۔ آپ نے میری دلچسپی کے لئے اپنے بیگ سے تاش نکال کر میرے سامنے رکھ دیے اور نہایت بے تکلفی سے بولے۔

"رمی جانتے ہیں آپ؟"

اب میں ان سے کیا کہتا کہ تاش کا شوق پنڈت جی نے جس دن سے ہاتھ دیکھا ہے۔ ایسا چھوٹا ہے کہ جیسے کبھی تاش کھیلتے ہی نہ تھے۔ اب یہ بادن پتوں والا خوفناک کھیل کون کھیلے۔ میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے ان کو دوسری باتوں میں لگانا چاہا۔

"آپ غالباً اس طرف کے رہنے والے تو نہیں ہیں؟"

وہ تاش کے پتے پھڑپھڑاتے ہوئے بولے۔

"جی نہیں میں تو پاکستان بننے کے بعد حاضر ہوا ہوں ورنہ غریب خانہ تو بانس بریلی ہے۔"

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ غریب خانہ بھی اس بیہودہ نے چھانٹ کر وہاں کا رکھا ہے۔ جہاں ایک چھوڑ دو 'ب' موجود ہیں یہ شخص ضرور آج کوئی

حادثہ کرائے گا۔ ارادہ کیا کہ آپ کا فرہو جو اس سے بات بھی کرے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ حضرت خود ہی بولے۔

"ویسے نہ وہ تم سے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے بھوالں"

گھبرا کر عرض کیا: "یہاں کیا شغل ہے جناب کا"؟

نہایت مسکین صورت بنا کر کہا: "بیکاری۔"

دیکھئے کتنا محفوظ سوال تھا۔ مگر کتنا تشویش انگیز جواب دیا ہے اس نامراد نے۔ مشاغل میں بہت کم ایسے ہوں گے جو 'ب' سے شروع ہوتے ہوں تا وقتیکہ آدمی۔ بدمعاش۔ بندر والا۔ بندوقچی۔ بہروپیہ۔ بساطی۔ بکر قصاب۔ برق انداز وغیرہ نہ ہو۔ یا پھر بیرسٹر ہو 'ب' والا پیشہ ڈھونڈھ کر بتانا آسان کام نہیں ہے۔ اب تو یہ بھی پوچھنا خطرے سے خالی نہ تھا کہ ہجرت سے پہلے جناب کیا شوق فرماتے تھے فرض کیجئے وہ کہہ دیں کہ بینڈ ماسٹر تھا میں۔ تو میں ان کا کیا کر لوں گا۔ میں نے در اصل ان سے ڈر کر اپنی توجہ باہر کی طرف مبذول کر دی اور کھڑکی سے باہر منہ نکال کر ان حضرت سے اپنے نزدیک محفوظ ہو گیا۔ اب لاکھ کچھ کہیں میں ہاں ہوں۔ نا نہیں میں مختصر جواب دیتا اور ان کو ٹالتا رہا آخر وہ نہایت ہی بے تکلفی سے میری ہی سیٹ پر آ کر بولے۔

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

بدمعاشی دیکھی آپ نے غالب کا شعر بھی وہ چھانٹا ہے جو 'ب' سے

شروع ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے جیسے اس شخص نے میری چڑ مقرر کر لی ہو.
میں نے ان حضرت سے کہا -

بات یہ ہے کہ میں کچھ شعر کہنا چاہتا ہوں آپ کے مشاعرے کی طرح میں.

کہنے لگے "صاحب طرح تو بہت شگفتہ ہے . ع

میں نے دامن جسے سمجھا تھا گریباں نکلا

مگر اس زمین کو تو غالب ختم کر گیا ہے یہ شعر کہہ کر کہ ؎

بوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

پھر 'ب' والا شعر، شعر اچھا ہے تو ہوا کرے کس کام کا وہ شعر جو 'ب' سے شروع ہوا ہو. اس شعر کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت طرح سے اچاٹ ہو کر رہ گئی اور میں نے گھبرا کر کہا "دوسری طرح بھی تو ہے"

وہ کہنے لگے "جی ہاں دوسرا مصرعہ ہے" ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اور میرا دل دھک سے رہ گیا کہ اب یہ غالب کا یہ شعر پڑھتے ہیں کہ ؎

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

مگر شکر ہے کہ ان کو یہ شعر پڑھنے کا موقع نہ ملا اور ایک اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہی ہوئی تھی کہ وہ حضرت بولے "یہاں کی بالائی بہت مشہور ہے

دیکھیے ابھی لا کر کھلاتا ہوں؟" حالانکہ اس نامعقول کو واقعی کھلانا ہوتی تو ملائی کہتا۔ بالائی نہ کہتا۔ میں اس کو یہ تو نہ سمجھا سکا کہ میں نے ہمیشہ بالائی کو ملائی سمجھ کر کھایا ہے مگر وہ ملائی کو بالائی کہہ کر میرے لیے خطرناک بنا رہا تھا۔ بہرحال میں نے عذر کر دیا کہ میں یہ چیز نہیں کھاتا اور وہ خود نہایت بے تمیزی سے پنج پنج کی ملائی کھا رہا تھا اور محض مجھ سے بچانے کے لیے اس کو بالائی کہتا جا رہا تھا۔ مگر جب اس نے دام دیتے ہوئے بارہ آنے گن کر دیئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بالائی نہ سہی ملائی نہ سہی مگر تھی تو بارہ آنے کی یہ تو بالائی تھی جس شخص نے باپ کو ہمیشہ والد سمجھا ہو بیٹے اور بیٹی کو ہمیشہ لڑکا اور لڑکی مانا ہو وہ ذرا سی بالائی پر اپنے اس دیرینہ اعتبار کو کیونکر قربان کر دیتا۔ بہرحال خدا خدا کر کے اس اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوئی ہی تھی کہ یہ حضرت ایک طرف انگلی اٹھا کر چیخے

"وہ دیکھئے بارہ سنگھا!"

کاش ان کو معلوم ہوتا کہ وہ خود بھی مجھے بارہ سنگھا ہی نظر آ رہے تھے۔ خیر یہاں تک تو سب کچھ برداشت کیا مگر ہوش تو اس وقت اڑے ہیں جب ان حضرت نے برسبیل تذکرہ فرمایا۔

"اس مشاعرے کے لئے بارہ دری سے بہتر مقام مشکل ہی سے مل سکتا تھا اور بارگاہ بھی ایسی سجائی ہے کہ 'باید و شاید' ایک تو بارہ دری میں مشاعرہ، دوسرے اس میں بارگاہ سجائی گئی ہے اور وہ بھی ایسی کہ باید و شاید۔ نہیں صاحب یہ مشاعرہ تو زندہ نہیں چھوڑ سکتا،

جہنم میں گیا مشاعرہ اور لعنت ہے اِس شاعری کے شوق پہ جان ہے تو جہان ہے۔ شکریہ ہے کہ راہِ فرار بھی مل گئی اگلے ہی اسٹیشن پر لاہور آنے والی گاڑی سے میل ہوتا تھا کہ میں ذرا ٹہلنے کو نکلا۔ دور تک نکل گیا۔ اس گاڑی تک آگیا جو لاہور کے لئے رینگ رہی تھی اور جست کر کے اس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ کھڑکی سے گردن نکال کر دیکھا کہ بارہ سنگھا اس ٹرین کی طرف دوڑ رہا تھا۔ چند کہیں کا۔

نسیم بکڈپو لکھنؤ کی شائع کردہ چند دلچسپ کتابیں

معمہ خاتون	شوکت تھانوی	1/8/-	کہکشاں	نسیم انہونوی	5/-
گرگٹ	"	1/8/-	نجم السحر	"	5/-
بڑھبس	"	2/-	مہ پارہ	"	4/-
مسکراہٹیں	"	2/8/-	تمنا	"	4/-
مونڈھی کاٹے	"	1/8/-	نشاط	"	4/-
شیطان کی ڈائری	"	1/8/-	شگفتہ	"	3/-
موت کا شہر	اکرم الہ آبادی	2/8/-	شبنم	"	2/-
بھوتوں کا شہر	اظہار اثر	2/-	طرز زندگی	"	2/-
دغاباز حسینہ	بدنام رفیقی	2/-	آخری خط	سلامت علی مہدی	3/-
دوست	رئیس احمد جعفری	3/8/-	صنم کدہ	خان محبوب طرزی	4/-
آنکھ کی چوری	مسعود جاوید	3/8/-	سفر زہرہ	"	2/-
لاشوں کا کھیل	"	3/8/-	حور اندلس	"	2/-
محل سرا	نادم سیتاپوری	3/8/-	زبیدہ	"	3/8/-
کہانی	مبین احسن نگرامی	3/8/-	نواب قدسیہ محل	"	3/-
نوبہار	شاہین فاروقی	2/-	بازار	مائل ملیح آبادی	3/8/-
تنویر	وحشی محمود آبادی	3/-	نیا آدمی	"	2/-
شمشیر مجاہد	"	2/-	پاسبان	"	4/-
انجم	قیسی رامپوری	3/8/-	عالم گم گشتہ	مظہر الحق علوی	3/-
بہادر دوشیزہ	صادق سرھنوی	3/-	گنج سلیمان	"	3/-